اپریل 2004

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

فروغ اردو کے سفر میں قومی اردو کونسل کی کامیابیاں

ملک کے 22 صوبوں کے 97 اضلاع میں کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی. کے 150 مراکز کا قیام
16397 طلبہ بشمول 7694 طالبات کمپیوٹر ڈپلوما سے سرفراز

ملک کے 11 صوبوں کے 14 اضلاع میں کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن کے 23 مراکز کا قیام

ملٹی لنگول ٹائپ اینڈ شارٹ ہینڈ کے 30 مراکز قائم کرنے کا منصوبہ

50 اردو اسٹڈی سینٹر قائم کرنے کا فیصلہ

ہندی اور انگریزی کے ذریعے اردو سکھانے کے ایک سالہ ڈپلوما کورس ان اردو لینگویج کا آغاز — دس ہزار طلبہ کا داخلہ

مدارس کے طلبہ کو فنکشنل عربی میں مہارت حاصل کرانے کے لیے دو سالہ عربی ڈپلوما کورس کا آغاز، 41 عربی اسٹڈی سینٹر قائم کرنے کا فیصلہ

دہلی، ممبئی اور سرینگر جیسے اہم اردو مراکز میں اب تک پانچ کل ہند اردو کتاب میلوں کا انعقاد، ایک کروڑ 20 لاکھ روپے کی کتابوں کی فروخت

دور دراز کی اردو بستیوں میں اردو کا علمی و ادبی سرمایہ پہنچانے کے لیے موبائل وین کے ذریعے کتابوں کی نمائش اور فروخت — موبائل وین کا اتر پردیش، بہار، جھارکھنڈ، مغربی بنگال، مدھیہ پردیش، مہاراشٹرا اور سرینگر کا کامیاب دورہ

اشاعتی پروگرام کے تحت 815 کتابوں کی اشاعت جن میں جامع اردو انسائیکلوپیڈیا، جامع انگریزی اردو ڈکشنری کے ساتھ ادب، سماجی و سائنسی علوم، نفسیات، طب و معالجات اور ادب اطفال کی معیاری کتب شامل ہیں

اردو پریس پروموشن اسکیم کے تحت 44 اردو اخبارات کو یو این آئی سروس مہیا کرانے کے لیے 50% سبسڈی کی فراہمی — اس مد میں اب تک 1,22,81,999 روپے کی ادائیگی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ ثانوی و اعلا تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

قیمت : -/10 روپے

● مونگیر۔صدر جمہوریہ ہند عالی جناب ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے گذشتہ دنوں مونگیر کا سفر کیا اور مونگیر کو روحانی قدروں کی سرزمین قرار دیا۔اس موقعے پر وہ خانقاہ رحمانی میں بھی تشریف لے گئے اور جامعہ رحمانی کے اساتذہ اور طلبہ سے ملاقات کی۔اس مشہور و معروف خانقاہ کو جید عالم دین اور بلند پایہ صوفی مولانا محمد علی مونگیریؒ نے 1901 میں قائم کیا تھا۔یہ خانقاہ آج بھی سلسلۂ نقشبندیہ قادریہ کی تعلیمات اور علمی اور دینی تحریک کا مرکز ہے،ساتھ ہی ساتھ اردو کتابوں کی نشر واشاعت کا اہم مرکز بھی رہی ہے۔خود حضرت مونگیری ماہرِ تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلما،لکھنؤ کے بانی اور صاحب تصنیف بزرگ گزرے ہیں۔خانقاہ رحمانی کی خدمات میں ان کے فرزند اور جانشیں مولانا منت اللہ رحمانی نے گراں قدر اضافہ کیا۔آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تحریک اور مدارس کے نصاب تعلیم میں اصلاح کا پیغام انھی بزرگوں کے ذریعے اہلِ علم اور مدارس تک پہنچا۔مدارسِ اسلامیہ کے تحفظ اور ترقی کی مضبوط آواز بھی اسی سرزمین سے بلند ہوئی۔ممتاز عالم دین اور اہلِ قلم مولانا محمد ولی رحمانی خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشیں،جامعہ رحمانی کے سرپرست اور رحمانی فاؤنڈیشن کے بانی ہیں،جہاں صحت وصحافت کے ساتھ قومی اردو کونسل کے زیرِ اہتمام کمپیوٹر ایپلی کیشن اور ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی سینٹر پانچ برسوں سے تعلیمی اور تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے۔

تصویر میں صدر جمہوریہ اور مولانا محمد ولی رحمانی کتب خانے میں مجمع کے سامنے تشریف فرما ہیں۔

ماہ نامہ

اردو دُنیا نئی دہلی

جلد۔6، شمارہ۔4 اپریل 2004

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاونین:
ارجمند آرا فیروز عالم

ناشر و طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلا تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: قومی اردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی 6

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
غیر ممالک کے لیے
10 امریکی ڈالر، سالانہ (بحری ڈاک سے)
15 امریکی ڈالر، سالانہ (ہوائی ڈاک سے)

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام روانہ کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی - 110 066
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746

شاخ: 5-4-4/435/20، گرین ہاؤس،
اسٹیشن روڈ، نام پلی، حیدر آباد 500001 (A.P.)
فون: 24615139

اس شمارے میں

آپ کی بات	خطوط	2
ہماری بات	اداریہ	5
● اردو ہندستانی زبان ہے	(مہمان اداریہ)	7
● فروغ اردو کے سفر میں میرے پانچ سال	مرلی منوہر جوشی	8
● ہندستان میں اردو — ماضی، حال اور مستقبل	ثروت اقبال	15
● امریکی درس گاہوں میں اردو اور ہندی	آشیش کمار سین	17
● نیپال میں اردو کی صورت حال	نسیم احمد نسیم	21
● اردو میں عربی کے خود ساختہ الفاظ	شفیع شیخ	23
● ہوائی جہاز کی اڑان کے سو سال	محمد جمیل	30
● ڈاکٹر الفریڈ اور نوبل انعام	ابوبکر عباد	34
● انسانی دماغ کا بہروپ	جتیندر ورما	36
گوشۂ ادب:		
● ابوالفیض سحر	محمد ولی رحمانی	37
● بادِ صبا کا انتظار	سید محمد اشرف	40
● شہریار سے گفتگو	علی ظہیر	46
گوشۂ فروغ کتب		
● انسانی حقوق ('' جامع اردو انسائیکلو پیڈیا'' جلد-3 (سماجی علوم) سے اقتباس)		48
● خاندان اور تعلیم ('' تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر'' سے اقتباس)	سلامت اللہ	50
طلبہ کے لیے		
● آئی آئی ٹی (اسکریننگ ٹسٹ) کی تیاری کیسے کریں (کیریئر گائیڈنس)	زبیر احمد بھاگلپوری	56
● ویب اور HTML	شفقت علی	58
● تاریخ ہند (کوئز)	شمیم اختر	60
● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-9)	محمد سیم الدین	63
اردو خبرنامہ	ادارہ	64
تبصرہ و تعارف	کتابوں پر تبصرے	73
● کلیاتِ مصحفی (جلد اوّل) / مرتبہ: نثار احمد فاروقی	مبصر: مصباح احمد صدیقی	
● صنعتی تنظیم اور انتظام / محمد احترام اللہ	مبصر: معین الدین خاں	
● نزدہ — علامت اور علاج / ابو سعد خالد جاوید	مبصر: حکیم اشہر قدیر	
● ادبی جہات / انور پاشا	مبصر: ابوظہیر ربانی	
● اردو ناول پر تقسیم ہند کے المیے کے اثرات / محمد نسیم	مبصر: فیاض عالم	
بچوں کا گوشہ		
● ننانوے کا پھیر ('' ہندستان کی کہانیوں کا خزانہ'' سے اقتباس)	شنکر	76
● ٹیلی ویژن: دیکھنے سے بچوں کے دماغ اور آنکھیں متاثر	رپورٹ	80

آپ کی بات

■ **محمد ولی رحمانی، سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی، مونگیر**

اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت با کرامت رکھے (آمین)۔ آپ کی سرگرمی سن کر اور دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے اور دل سے دعا نکلتی ہے۔ ''اردو دنیا'' پڑھتا رہتا ہوں اور کس بری طرح پڑھتا ہوں، اس کی ایک مثال یہ ہے: نومبر 2003 کا شمارہ، آخری صفحہ، اشتہار والا ملاحظہ کیجیے۔ ''قومی زبان'' ـــ ''بھارت 2002''، دونوں اشتہار کا مضمون ایک ہے۔ اتنے محنتی طالب علم کو علمی رسالہ بھیجا جا سکتا ہے۔ بخیر ہوں اور آپ پر فتوحات کے دروازے وار ہیں اس کی دعا کرتا ہوں۔

■ **انظر شاہ مسعودی کشمیری، جامعہ دارالعلوم (وقف) دیو بند- 247564**

مجلے کے تمام مضامین و مقالات معلومات افزا اور نئے نئے پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ حقیقت کسی مبالغہ اور توریہ کے بغیر قلم پر آگئی جبکہ سابق میں دلنشیں تھی اور دماغ پر چھائی ہوئی کہ یہ صرف آپ کا کارنامہ ہے کہ ان حالات میں آپ صرف اپنے ادارے کو سنبھالے ہوئے نہیں بلکہ روز افزوں ترقی دے رہے ہیں۔ یہ اردو کی بیش بہا خدمت ہے۔

■ **جگن ناتھ آزاد، اے-25، گورنمنٹ کوارٹرز، گاندھی نگر، جموں، (جموں وکشمیر)**

پہلے تو اس بات پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کریں کہ سال رواں کی نیشنل کونسل کی سالانہ جنرل میٹنگ اور ساتھ ہی نئے کمپلیکس کے سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب، دونوں ہر طرح کامیاب رہیں۔ اس کامیابی کا سہرا آپ اور آپ کے رفیقان کے سر ہے۔

میں چونکہ اس ادارے کے ساتھ اُس زمانے

■ **جیلانی بانو، پلاٹ-71، ہدیٰ ہائٹس، روڈ نمبر-12، بنجارہ ہلز، حیدر آباد-500034**

''اردو دنیا'' مل رہا ہے۔ اب یہ رسالہ ادبی رسالوں کی اہم صف میں شامل ہو گیا ہے۔ خاص طور سے تحقیقی اور تنقیدی مضامین بہت اچھے آ رہے ہیں۔ فروری کے پرچے میں عبدالستار دلوی صاحب کا مقالہ بہت اہم ہے۔ انھوں نے ممبئی کی اردو بولی کے مخصوص انداز پر لکھا ہے۔ اس موضوع پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ آج آپسی میل جول کے لیے اور بڑھتے ہوئے سیاسی اور معاشی مسائل کی وجہ سے ہر علاقے کی مخصوص اردو اور اس کی لسانی خصوصیات کو باقی رکھنے کی ضرورت ہے۔ حیدر آباد کی مخصوص دکنی اردو اور اس کے بولنے کا انداز رفتہ رفتہ ختم ہو رہا ہے۔ اس لیے میں نے حیدر آبادی اردو کو محفوظ کرنے کے لیے بارہ آڈیو کیسٹس میں اسے محفوظ کیا تھا۔ نثر کی پہلی کتاب سب رس اور قلی قطب شاہ کی شاعری سے ابتدا کی۔ پھر ایک چھوٹے بچے کے کہانی کہنے کے انداز سے سو برس کی ایک شہزادی کا انٹرویو لیا۔ حیدر آبادی ادیب، شاعر، نیوز ریڈر، طالب علم، مزدور خواتین، ساس بہو کی لڑائی، لوک گیت، مرثیے، چکی اور ڈھولک کے گیت، مزاحیہ شاعری اور کامیڈی پروگرام، ہر طبقے کے عوام اور وزیروں، ایڈیٹروں کے انٹرویو اور شاعروں کا کلام وغیرہ۔ عابد رضا بیدار صاحب کو یہ پروگرام بہت پسند آیا تھا۔ انھوں نے اس کیسٹ کے سیٹ کو خدا بخش لائبریری کے لیے لیا تھا اور اسی انداز میں بہاری اردو کو محفوظ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ حمید الدین شاہد صاحب نے بہادر یار جنگ لائبریری (کراچی) کے لیے اور نظام اردو لائبریری (حیدر آباد) نے بھی ان کیسٹوں کو اپنی لائبریری کے لیے لیا تھا۔

میں چاہتی ہوں نیشنل کونسل بھی ایسے پروگرام پر غور کرے یا پھر ہر علاقے کے اردو نقاد اردو کے اس مخصوص انداز پر غور کریں۔

سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ چلا آ رہا ہوں جب یہ ترقی اردو بورڈ اور ترقی اردو بیورو نام کے دو حصوں میں منقسم تھا۔ اس لیے اپنے تجربے اور آنکھوں دیکھی صورتِ حال کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ بورڈ یا بیورو اور کونسل کے کام اور کام کے نتائج میں زمین آسمان کا فرق نظر آ رہا ہے۔ ملک بھر کو بلکہ ہمارے وطنِ عزیز سے باہر بھی اردو دنیا کو یہ ترقی مبارک ہو!

■ **محمد اسحاق جمخانہ والا، صدر انجمن اسلام، ممبئی**

مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ 14 رفروری کو قومی اردو کونسل کے صدر دفتر کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ بعض مصروفیات کی وجہ سے میں اس میں شریک نہیں ہو پاؤں گا۔ اللہ سے میری دعا ہے کہ یہ تقریب بے حد کامیاب ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اپنی عمارت کے مکمل ہو جانے کے بعد قومی اردو کونسل اردو زبان کی ترویج و ترقی کا کام مزید تیزی سے کر سکے گی۔

■ **علی احمد فاطمی، شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی،**

سنگِ بنیاد سے متعلق آپ کا جلسہ بے پناہ کامیاب رہا، دلی مبارک باد قبول کیجیے۔ آپ نے اس بزم میں مجھے بھی شرکت کا موقع دیا۔ اس کا بے حد شکریہ۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی آپ اپنے اور ادارے سے مجھے جوڑے رکھیں گے۔

اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ادارے کو آپ جیسا ڈائرکٹر مل گیا ہے جو شب و روز صرف اردو اور کام کے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہے اور کام کرتا رہتا ہے۔ آج اردو کو ادیب و ناقد سے زیادہ مجاہد کی ضرورت ہے اور اس کو آپ جیسا مجاہد مل گیا ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔

■ **کشمیری لال ذاکر، چیئرمین جن شکشن سنستھان، ایس.بی.او-313، (فرسٹ فلور) سیکٹر-38، ڈی، چنڈی گڑھ**

میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ اپنی مسلسل کوششوں سے کونسل کے دفتر کے لیے ایک بڑی اراضی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

میں نے عزت مآب منسٹر ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی، ڈاکٹر رفیق زکریا اور دیگر افراد کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ آپ نے اردو کے شیدائیوں اور کونسل کے بہی خواہوں کے لیے ایک بے مثال اور انوکھا کام کیا ہے۔ میں نے یہ اعتراف کھلے طور پر کیا کہ میں ترقی اردو بیورو سے بھی جڑا ہوا تھا لیکن اس نے زبان کے فروغ کے لیے کچھ نہیں کیا۔ قومی اردو کونسل کے قیام کے بعد ہر میدان میں نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ میرا خیال ہے کہ اس میٹنگ میں موجود تمام لوگوں تک یہ مشاہدہ پہنچا ہوگا۔ میں کونسل کے تمام پروگراموں اور فروغ اردو کی کوششوں میں اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

■ **ایم.ایم.واثق، ڈائرکٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، کوٹی گیپالیہ، مگاڈی مین روڈ، بنگلور-560091**

اخبارات کے ذریعے مجھے پتہ چلا کہ قومی اردو کونسل کے صدر دفتر کا سنگ بنیاد جسولہ، نئی دہلی میں رکھا گیا ہے۔ مبارکباد قبول کریں۔ یہ صرف آپ کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ آپ کی فعالیت اور طریقۂ کار نے اردو اور قومی اردو کونسل کو نئے تناظر عطا کیے ہیں۔ میں آپ کی کرشماتی شخصیت کا مداح ہوں اور آپ کی صحت اور لمبی عمر کے لیے دعا گو ہوں۔

میں ایک بار پھر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ کی قیادت میں قومی اردو کونسل ترقی کی نئی منزلوں سے آشنا ہوگی۔

■ **فصیح اکمل، 102، بی-6، سیکٹر-10، شانتی نگر، میرا روڈ (ای) تھانے**

ماہنامہ ''اردو دنیا'' جس آب و تاب اور تعمیری اقدامات کے پیش نظر آپ کی مخلصانہ ادارت میں شائع ہو رہا ہے، اُس کے لیے ہزار ہزار مبارکباد۔

''اردو کتاب میلے'' کے نقوش ابھی تازہ ہیں، جنوری کا شمارہ پیش نظر ہے فاضل علوم مشرقیہ و مغربیہ محترم نثار احمد فاروقی کا مضمون ''ہندستان اور قدیم عرب مورخین'' ہم جیسے طالب علموں کے لیے نہایت چشم کشا ہے۔

منٹو کے افسانے کا انتخاب بھی آپ کے حسنِ انتخاب کا معیار متعین کرتا ہے اس کے علاوہ اردو کے تعلق سے جو پیش رفت ہو رہی ہے اُس سے توقعات کے چراغ روشن ہوتے ہیں، اور ٹوٹتی سانسوں کو حوصلہ اور توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ خدا آپ کو اور نائب مدیرہ محترمہ ارجمند آرا کو تا دیر تازہ دم رکھے (آمین)۔

آپ جس خلوص اور متواتر لگن سے کام کر رہے ہیں اُس کی داد نہ دینا کوتاہ نظری ہے، میرے حلقۂ ''ہم نوا علمی مجلس'' کے تمام احباب آپ کے لیے دست بدعا ہیں۔

■ **ابرار اعظمی (سابق صدر، شعبۂ تربیت اساتذہ، پوسٹ گریجویٹ کالج، مالٹاری، اعظم گڑھ، پوروانچل یونیورسٹی) خالص پور، اعظم گڑھ (یوپی)**

مارچ کا ''اردو دنیا'' پیش نظر ہے۔ سرورق کی تصویر معنی خیز ہے۔ وزیر برائے ترقی انسانی وسائل ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کا ''ایوانِ اردو'' کا سنگ بنیاد رکھنا بذات خود ایک حیرت انگیز مگر خوش آئند اور مستقبل افزا عمل ہے اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس عمل میں ''دینے والے'' سے ''لینے والے'' کا کردار کم اہم نہیں۔

ڈاکٹر جوشی نے اپنی تقریر میں متعدد فکر انگیز باتیں کہی ہیں۔ خبرنامہ میں ظاہر ہے اقتباسات ہی دیے جاسکتے تھے۔ بہتر ہوگا کہ ان کی پوری تقریر شائع کی جائے اور اس کے مختلف نکات پر ''یارانِ نکتہ داں'' کو ''صلائے عام'' دی جائے کہ اردو زبان کے سلسلے میں نظری مباحث بھی ہوں اور عملی اقدامات کا تعین بھی کیا جاسکے۔

میں ڈاکٹر رفیق زکریا کے اس قول کی تائید و تصدیق کرتا ہوں کہ ''ڈاکٹر جوشی نے پانچ سال میں اردو کے لیے جو کچھ کیا وہ آزاد ہندستان کی تاریخ میں کسی دوسرے وزیر نے نہیں کیا۔''

■ **اقتدار راسخ خاں، 4/757، گلزار محمود، فرینڈز کالونی، سول لائنز علی گڑھ**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ یہ رسالہ نہ صرف اپنی نوعیت، انفرادیت اور معلومات کے لحاظ سے ممتاز ہے بلکہ اپنے معیار اور مفید و دلچسپ مضامین کے لیے بھی اپنی ایک الگ شناخت بنا چکا ہے۔ اس بار ''ہماری بات'' اور ساتھ میں لیلا وساریا کا مضمون (مترجم مشرف علی) نے سماج کی ایک اہم اور تشویش ناک صورت حال کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان کے علاوہ ایڈورڈ سعید کا مضمون ''دانشوروں کا رول'' (مترجم صدیق الرحمٰن قدوائی، اسلم پرویز) اور ''گوشۂ ادب'' میں ''عطا محمد شعلہ'' انتہائی قابل قدر اور معلومات افزا تحریریں ہیں۔

■ **ایم کوثر ضیاوی راہی، قاضی پور، خورد، گورکھپور-273001**

''اردو دنیا'' برابر مل رہا ہے، اس عنایت کے لیے دل سے شکر گزار ہوں۔ آپ کا یہ جریدہ ماہ بہ ماہ آگے بڑھتا جارہا ہے۔ اردو زبان و ادب سے متعلق ہندو پاک ہی نہیں دنیا بھر کی خبریں آپ فراہم کردیتے ہیں، ادھر ادبی تخلیقات بھی آرہی ہیں، اردو دنیا صحیح معنوں میں ایک بین الاقوامی جریدہ کہے جانے کا مستحق ہے۔ مبارکباد قبول کریں۔

مارچ کے شمارے میں کئی چیزیں خوب ہیں، عطا محمد شعلہ پر رفعت سروش کا تاثراتی مضمون، کملیشور سے مشتاق صدف کی پر مغز بات چیت، اردو ڈراموں کے انتخاب سے لیا گیا ریوتی شرن شرما کا ڈرامہ ''انسان'' اور حکیم اشہر قدیر کا نہایت قیمتی مضمون ''درد اور علاج''۔

بہت اچھا ہوتا کہ ہر شمارے میں ایک کہانی، ایک نظم اور ایک غزل بھی دے دی جاتی۔

■ **راشد جمال فاروقی، اے-1498، آئی. ڈی. پی. ایل. ٹاؤن شپ، ویر بھدرا (رشی کیش) دہرہ دون، اترانچل**

قومی اردو کونسل آپ کی قیادت میں جن بلندیوں کو چھو رہی ہے انھیں دیکھ کر آپ کی درازیٔ عمر کی دعائیں کرتا ہوں۔ میں گذشتہ پچیس برسوں سے اردو کے معیاری رسائل میں متواتر چھپ رہا ہوں۔ اردو دنیا میں بھی میرا مضمون ''اترانچل میں اردو'' شائع ہو چکا ہے جس کو کافی پسند کیا گیا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے انگریزی ادب کا استاد ہوں اور بے لوث اور خاموش طریق پر ادب خصوصاً اردو ادب کے لیے کام کر رہا ہوں۔ آپ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تشکیل نو کی ہے۔ تمام نمائندگان بلاشبہ اپنے اپنے میدان کے شہسوار بھی ہیں اور اردو کے خدمت گار بھی۔ آپ کی فہرست میں اترانچل کو فراموش کر دیا گیا ہے اگر میں اردو کے مشن میں آپ کے ساتھ چل سکوں تو میری خوش قسمتی ہوگی۔

■ **امجد جاوید، حلیمہ ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ، ایس. ایف. ایس. 13، ایم. آئی. جی. سیکنڈ، کے. ایچ. بی. کالونی ڈگل گیرہ، نزد بلال آباد، گلبرگہ**

کمپیوٹر سنٹر بہت ہی کامیابی سے چل رہا ہے۔ تمام سہ ماہی ٹسٹ (Quarterly Module Test) کامیاب ڈھنگ سے منعقد ہوئے۔ طلبہ و طالبات کی حاضری بہت ہی اچھی اور اطمینان بخش ہے۔ Dropout نہ کے برابر ہے۔ صبح و شام شخصی نگرانی میں اس کی کارکردگی کو بہتر سے بہتر بنا رہا ہوں۔ ہمارے سنٹر کی شہرت یہاں روز افزوں ہے۔ یہ صرف اور صرف آپ کی اعانت، تعاون، مدد اور دست گیری کی بدولت ہی ممکن ہو سکا ہے۔

ممبئی میں پانچواں کل ہند اردو کتاب میلہ بہت ہی کامیاب طریقے سے منعقد ہوا۔ یہ اطلاع پڑھ کر بے حد خوشی و مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے کہ وہ آپ کی ہر کوشش و کاوش کو کامیابی سے ہمکنار کر رہا ہے اور یہ آپ کی سچی اور نیک نیتی سے کی گئی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔

■ **واجد اختر صدیقی، #11-1041/50A/4، غالب کالونی، جیلان آباد، گلبرگہ-585103**

فروری 2004 کا شمارہ مطالعے میں ہے۔ ہمیشہ کی طرح یہ شمارہ بھی اپنے معیار کی بلندیوں پر ہے۔ ''ممبئی کی اردو ایک لسانی مطالعہ'' اچھا مقالہ ہے۔ آپ کے اداریے خیال انگیز اور معلوماتی ہوتے ہیں۔ درخشاں زریں نے لسانیات پر بڑی محنت سے کوئز تیار کی ہے۔ کتابوں پر تبصرے کا کالم خوب ہے۔ راقم الحروف کی کتاب ''تعلیم: احتساب و توازن'' بھی تعلیمی مضامین کو محیط ہے جس میں 17 مختلف مضامین شامل ہیں۔ تمام موضوعات آج کے سلگتے سماج کی دین ہیں۔ بہرحال ہر شمارے کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔

اردو خبرنامہ اس رسالے کی جان ہے۔

■ **زبیر احمد بھاگلپوری، اردو شعبہ، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ-800015**

''اردو دنیا'' پابندی سے موصول ہو رہا ہے جس سے قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں کی جانکاری بھی مل رہی ہے۔

شہر شہر کتابوں کی نمائش کے ذریعے علم و آگہی کی اشاعت اور پورے ہندستان میں اردو کمپیوٹر کے نیٹ ورک کے قیام سے آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ قومی اردو کونسل نہ صرف اردو دنیا کی رہنمائی کی اہل ہے بلکہ سائنس و ٹیکنالوجی کے اس عہد میں وہ ملت کی مجموعی تعلیمی ضرورت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہے بشرطیکہ ملت کا مکمل تعاون اسے حاصل ہو۔

■ **مشتاق احمد فلاحی، مرکز الامام البخاری التعلیمی والخیری تکولی، برفا ٹھانہ، ممبئی، مہاراشٹر**

''اردو دنیا'' باصرہ نواز ہوا، بنظرِ غائر مطالعہ کیا۔ اللہ اسے نظرِ بد سے بچائے اور میدانِ صحافت میں رواں دواں رکھے تاکہ یہ آسمانِ صحافت سے اپنی پوری تابانیوں سے جگمگاتا اور ادبی قالب میں ڈھالتا رہے۔

■ **عبداللہ شیخ، آکولہ**

مارچ 2004 کے شمارے میں ایوانِ اردو کا سنگِ بنیاد دیکھ کر خیال آیا کہ اب اردو دنیا بھارت کی ہمالیہ پربت، بین المذاہبی، تہذیبی، ثقافتی، سائنسی، ہندو مسلم سکھ عیسائی، مراٹھے، گجراتی، بنگالی، مدراسیوں کی دلی امنگوں کی عکاس ہے جس کے میر کارواں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ ہیں۔ شمارہ سائنسی، تہذیبی، علمی، ادبی مضامین سے بھرپور ہے۔ ارجمند آرا نے کرشن راج کو جو خراجِ عقیدت پیش کی ہے اس میں ان کے ساتھ دوسرے بھی شریک ہیں۔

■ **عارف اٹاروی، 553/A، مردہی ٹولہ سیتاپور، یوپی-216001**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ مارچ 2004 موصول ہوا۔ شمارے کے تمام مضامین معلومات سے بھرپور ہیں۔ مضامین میں درد اور علاج، اردو ادب اور انقلاب 1857، لڑکیوں کی گھٹتی ہوئی تعداد، دانشوروں کا رول، اکیسویں صدی کے ہندستان میں اردو اور اردو خبرنامے کی تمام رپورٹیں پسند آئیں۔

■ **محمد ظفرالدین، پبلک ریلیشن آفیسر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی**

کونسل کے ذاتی نئی عمارت کی تعمیراتی پیش قدمی کے لیے مبارکباد قبول کیجیے۔ میں نے spot پر پہنچ کر وہ جگہ دیکھی اور خوش ہوا۔ یقیناً اس میں ایک آڈیٹوریم کی بھی گنجائش ہوگی تاکہ بہت بڑی نہ سہی ڈیڑھ دو سو شرکا کی تقریب خود اپنی ہی عمارت میں منعقد ہو سکے۔

ہماری بات

قومی اردو کونسل نے اپنی تشکیل کے فوراً بعد فروغ اردو کا لائحۂ عمل تیار کرنا شروع کیا اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ اردو کے فروغ کا ایجنڈا اہم عصر چیلنجز کے تناظر میں مقرر کیا۔ دوسرے اس بات کی کوشش کی کہ اردو زبان کے فروغ کی حکمت عملی قومی پالیسی سازی کا حصہ بنے۔ کونسل نے اردو، مسلمان اور اسلام کی Trinity یا اردو، کو جان بوجھ کر ہندی ہارٹ لینڈ سے نکالے جانے اور اردو کے مسئلے کو تقسیم وطن سے جوڑنے جیسی نظریاتی بحثوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی کیوں کہ اس طرح کی نظریاتی بحثوں میں پڑ کر فروغ اردو کے بنیادی مشن پر عمل درآمد ناممکن تھا۔ ہمارا ملک ہندستان کثیر لسانی منظرنامہ پیش کرتا ہے۔ اس لیے یہاں کئی زبانوں کے بولنے والوں کو یہ محسوس ہوتا ہوگا کہ شاید ان کے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے، کچھ لوگ وقتاً فوقتاً اس کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ اردو کا معاملہ یہ ہے کہ آٹھویں شیڈول میں اسے قومی زبان کی حیثیت دی گئی ہے۔ لہٰذا اس کا فروغ اور اس کے بولنے والوں کا بھی فروغ، ایک آزاد مملکت میں جمہوری روایت کے مطابق ہونا چاہیے۔ زبانوں کے فروغ کا معاملہ کسی سرکاری پالیسی اور چند مخصوص لوگوں کے چاہنے یا نہ چاہنے پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ زبانیں اپنے مستقبل کا سفر خود ہی طے کرتی ہیں۔ لیکن ایک بات جو سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے یہ ہے کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور انفارمیشن explosion کے بعد ساری زبانوں کو انگریزی سے ضرور خطرہ محسوس ہورہا ہے۔ انگریزی بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا، ہمارے سماجی اور تعلیمی عمل اور excellence کی بات انگریزی سے جڑ گئی ہے، اس لیے انگریزی کا بول بالا تو ہونا ہی ہے۔ جن کے پاس ٹیکنالوجی ہے، جن کے پاس زیادہ اچھا لٹریچر ہے اور جو لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی میں آگے ہیں، ان کی زبان کو آگے بڑھنا ہی ہے۔ مثلاً جب عرب کلچر سارے ہندستان پر چھا رہا تھا تب عربی زبان بہت آگے بڑھی۔ ہندستان میں ساڑھے سات سو سال تک فارسی زبان کا رواج اور بول بالا رہا اور اس وقت کے تمام بڑے ہندو اسکالر فارسی خوب جانتے تھے۔ آج اگر insecurity محسوس ہوسکتی ہے تو وہ انگریزی زبان سے ہی ہوسکتی ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ انگریزی سے ہندستانی زبانوں خصوصاً اردو کے وجود کو کوئی خطرہ ہے۔ جب ہم اردو کے ارتقا پر نظر ڈالتے ہیں تو فارسی اور عربی الفاظ نکال دینے کے بعد بھی اردو زبان کا دائرہ پورے شمالی ہند، گجرات اور مہاراشٹر تک پھیلا ہوا لگتا ہے۔ اس لیے جس زبان کو ملک کی اتنی بڑی آبادی بولتی ہو، بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندستان کی 60 فیصد آبادی ایسی ہے جس کا فطری رجحان اردو کی طرف ہے، پھر یہ زبان کیوں کر رد ہوسکتی ہے۔ بیرونی زبانوں سے اردو نے جو استفادہ کیا، خصوصاً فارسی اور عربی سے، اس کی ایک دین اردو کا sophisticated لہجہ ہے جو بھوجپوری، اودھی اور گجراتی سے مختلف ہے اور یہ اس زبان کا نکھار ہے۔ اگر اس رنگ اور نکھار کو الگ کردیا جائے تو شمالی ہند کی ساری زبانوں کا نیچرل جھکاؤ اردو کی طرف ہوجاتا ہے۔

اردو تہذیب ہندستان کی بنیادی تہذیب ہے اور اردو زبان شمالی ہند سے مہاراشٹر تک ایک بنیادی رابطے کی زبان ہے۔ اردو اس ملک کی سب سے بڑی لنگوا فرینکا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو داں طبقہ ملک کا سب سے پس ماندہ طبقہ ہے۔ ہندستان کے human development index میں سب سے نیچے اردو والے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والے ورلڈ مین اسٹریم میں آئیں۔ یہ ان کا حق ہے کہ جھگیوں سے نکل کر ایک اچھی آبادی میں رہیں، اردو، فارسی اور عربی پڑھنے کے بعد انگریزی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی طرف رخ کریں اور نئی تعلیم کے فوائد ان کی جھولی میں بھی آئیں۔

آج قومیت کا تصور وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ چونکہ اقوام انسانوں پر مشتمل ہیں، انسان کی ضروریات بدلتی ہیں، ہمارے مطالبات، ہمارے تقاضے بدل رہے ہیں، ہماری سوچ بدل رہی ہے۔ آج Genetic Engineering کی بات ہورہی ہے، ہیومن ڈیولپمنٹ کی بات ہورہی ہے تو پھر ایسے ماحول میں لفظوں کے مفاہیم میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے۔ قومی مفاد اگر نئی ضروریات، نئی ٹیکنالوجی اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ منجمد ہوکر رہ جاتا ہے اور اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ قومی دھارے کا تصور چاہے وہ کسی بھی طبقے کا ہو، چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والوں کا تصور ہو، جب وہ منجمد ہوجائے گا تو ہم عصر تقاضوں سے الگ جاپڑے گا۔ ہندستان کو انشاء اللہ بہت آگے بڑھنا ہے۔ چنانچہ ہمارے مفادات وقت کے تناظر میں بدلتے چلے جائیں گے۔ کونسل نے ابتدا میں ہی یہ طے کیا تھا کہ اردو کو قومی پالیسی سازی کا حصہ بننا چاہیے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس مقصد میں ہمیں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

کونسل کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں گذشتہ پانچ چھے برس میں انفارمیشن ٹیکنالوجی، کمپیوٹنگ اور روزگار کے مواقع دیگر ہندستانی زبانوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ اردو میں میسر ہیں۔ کونسل نے کشمیر سے کنیا کماری تک ہر جگہ کمپیوٹر سینٹر، ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سینٹر، کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن ٹریننگ سینٹر کھولے جن میں ہر سال 11 ہزار طلبہ ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کی تعلیم حاصل کررہے ہیں اور انھیں سرٹیفکیٹ ملک کی سب سے بڑی

کمپیوٹر سرٹی فکیٹ اتھارٹی ڈ یک سوسائٹی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندی اور انگریزی کے ذریعے اردو سکھانے کے لیے سرٹیفکیٹ کورس بھی شروع کیا گیا ہے جس میں ہر سال دس ہزار لوگ اُردو اسکرپٹ سیکھنے کے لیے داخلہ لے رہے ہیں اور ان میں 60فیصد سے زائد غیر مسلم ہوتے ہیں۔ جہاں تک کتابوں کی اشاعت کا تعلق ہے تقریباً پانچ چھے سو نئے ٹائٹل کونسل نے پچھلے تین چار برسوں میں شائع کیے ہیں۔ اردو اخبارات اور رسائل کے تعاون کے طور پر انھیں یو این آئی کی خدمات کی فراہمی کے لیے 50فیصد سبسڈی دی جارہی ہے۔ اس طرح اردو اخبارات کے معیار میں بہتری آئی ہے اور ان کا سرکولیشن بھی بڑھا ہے۔ ان سارے اقدامات سے اردو تعلیم اور اردو داں طبقے کو قومی دھارے میں لانے میں بڑی مدد ملی ہے۔

آج اس بات کی بے حد ضرورت ہے کہ تمام تعلیمی اداروں کی ہندستان گیر سطح پر ایک نیٹ ورکنگ ہو۔ ہندستان ایک وفاقی ملک ہے، یہاں پر مرکزی سرکار کے ادارے ریاستوں میں اس وقت تک زیادہ کچھ نہیں کر پائیں گے جب تک کہ ریاست اور مرکز کے اداروں کے درمیان ایک وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل پیدا نہ ہو۔ ہم ریاستی سطح پر بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن وہاں کے ادارے ہماری حکمتِ عملی پر کام نہیں کرتے، جس سے کام کی رفتار متاثر ہوتی ہے۔ عمدہ کتابوں کی اشاعت پر بھی خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اردو کی کتابیں ملک کے ہر کونے میں دستیاب ہونی چاہئیں۔ جہاں انگریزی اور ہندی کی کتابیں ملتی ہیں وہاں اردو کی کتابیں بھی ملنی چاہئیں۔ اس کے لیے سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

ریاستی اردو اکادمیوں کو بھی فعال بنانا ضروری ہے۔ کونسل کو ہم نے حکومتِ ہند کے پروگراموں سے جوڑ دیا، جس کے نتائج سامنے ہیں۔ اکیڈمیاں ریاستی حکومت کے پروگراموں سے جڑ نہیں پاتیں۔ ریاستی سرکاروں کو اردو اکادمیوں کو تعلیمی عمل میں بڑے پیمانے پر شامل کرنا ہوگا۔

قومی اردو کونسل نے 85لاکھ روپے کے بجٹ سے شروعات کی تھی اور آج اس کا بجٹ 10 کروڑ روپیہ ہے۔ گزشتہ چھے برسوں میں اردو سے متعلق ہندستان میں کوئی بھی ایسی بڑی سرگرمی نہیں ہوئی جس میں کونسل کا کچھ نہ کچھ حصہ نہ رہا ہو۔ کونسل اس معاملے میں خوش نصیب رہی ہے کہ اسے اردو داں طبقے، اردو دانشوروں، اسکالر اور اردو کے چاہنے والوں کا بھرپور تعاون ملا اور اس خوبصورت زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں۔ اردو والوں کو ورثے میں جو خوبصورتیاں ملی ہیں، یہ خوبصورتیاں اسی وقت نکھر پائیں گی جب وہ بدلتے ہوئے منظرنامے اور نئی ٹیکنالوجی سے پوری طرح جڑ جائیں گے۔

اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ

پروفیسر محمد حسن

ادبی سماجیات ایک نئے علم کی حیثیت سے حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب اردو میں ادبی سماجیات کے مطالعے کی پہلی کوشش ہے جو اس کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

پہلی اشاعت

334 صفحات، قیمت:98.00روپے

اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

مصنف برسوں تک آل انڈیا ریڈیو میں ذمے دارانہ عہدوں پر رہے ہیں، انھوں نے باریک بینی کے ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی زبان پر گفتگو کی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے قلم کاروں کے لیے یہ کتاب خصوصی افادیت رکھتی ہے۔

پہلی اشاعت

646 صفحات، قیمت:200.00روپے

اردو ڈراموں کا انتخاب

مرتب: پروفیسر محمد حسن

1947ء سے 1990 تک اردو میں لکھے جانے والے ڈراموں کا ایک نمائندہ انتخاب جن میں تاریخی، نیم تاریخی، سماجی اور سراسر تمثیلی ڈرامے بھی شامل ہیں۔ ابتدا میں فاضل مرتب نے ڈرامے کے فن اور اس کی روایت پر بھرپور گفتگو کی ہے۔

پہلی اشاعت

600 صفحات، قیمت:156.00 روپے

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت

رشید الدین خاں

اس کتاب میں مولانا آزاد کی زندگی کے سوانحی گوشوں پر بہ طور خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات:684، قیمت:58.00روپے

مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت، سیاست، پیغام

رشید الدین خاں

مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے علمی اور عملی کارناموں کا مکمل تعارف۔

(دوسرا ایڈیشن)، صفحات:336، قیمت:76.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم نئی دہلی-110066

مہمان اداریہ

اردو ہندستانی زبان ہے

1947 میں تقسیم ہندستان کے بعد سیاسی انقلاب کا تصور پیش کرنے والی اردو زبان کو تقسیم کی زبان قرار دے کر اس کے خلاف نفرت پھیلانے کی تحریک فرقہ وارانہ عناصر نے شروع کی۔ حالانکہ اردو زبان کے ادیبوں، شاعروں اور مفکروں کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے بیشتر اردو اخبارات نے تقسیم ہندستان کی ڈٹ کر مخالفت کی تھی۔ المیہ یہ ہے کہ اردو کو تقسیم کی زبان قرار دینے کی نفرت آمیز مہم کے خلاف لوگوں کو منظم کرنا دور کی بات ہے اس تصور کی اردو والوں نے بھی آبیاری کی۔ لیکن اردو کو تقسیم کی زبان قرار دینے کی تحریک چند برسوں کے بعد دم توڑ گئی لیکن اس کے ساتھ ہی جنم لیا اس غیر حقیقی نظریے نے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس غیر حقیقی نظریے کے فروغ میں سیاسی جماعتوں نے چناؤ سیاست کے اغراض کے لیے نمایاں رول ادا کیا۔ کئی سیاسی پارٹیوں نے اپنے چناؤ منشور میں اقلیتی فرقے کے مسائل کو اردو زبان سے جوڑ دیا اور یہ سلسلہ ماضی قریب تک جاری رہا۔ بدقسمتی سے اردو کے مفکروں، اردو زبان کے نام پر اعلا عہدے حاصل کرنے والوں، اعزازات حاصل کرنے والے ادیبوں اور دانشوروں نے بھی اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اس پر نہ صرف قہر توڑ دیا بلکہ اس کو قومی دھارے سے اس حد تک دور کیا کہ اردو زبان اپنے ہی ملک میں الگ تھلگ پڑ گئی۔ اردو پڑھنے والوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اردو زبان روزی روٹی سے جڑ نہیں سکتی جس کی وجہ سے اردو زبان سکڑتی رہی جبکہ اردو ادیبوں کی سرگرمیاں جاری رہیں۔

اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دینے میں اردو اداروں خاص کر اردو اکادمیوں اور سرکاری گرانٹ حاصل کرنے والے اردو اداروں نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک اہم رول ادا کیا۔ اخبارات کے غیر مسلم مدیروں اور غیر مسلم اردو دانشوروں نے وقت وقت پر اس منفی سوچ کے خلاف احتجاج کیا لیکن اردو کے ٹھیکیداروں اور بیوپاریوں کے ساتھ ساتھ ان حلقوں نے بھی جو اردو کو تقسیم کی زبان قرار دیتے رہے ہیں اس احتجاج کو نظر انداز کیا۔ آج حالت یہ ہے کہ اردو زبان کو ہندستان کے معاشرے میں جو اونچا مقام حاصل ہونا چاہیے تھا وہ حاصل نہیں ہوسکا۔ سرکار سیکولر پارٹیوں کی ہو یا غیر سیکولر محاذوں کی، دونوں نے اردو زبان کو نظر انداز کیا۔

اس پس منظر میں 14 رفروری کا دن اردو زبان کو ہندستانی زبان قرار دینے کا تاریخی دن ہے۔ اس روز وزیر برائے فروغ انسانی وسائل مرلی منوہر جوشی نے کونسل برائے فروغ اردو کی کونسل کی میٹنگ میں الفاظ چبائے بغیر یہ اعلان کیا ''اردو مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندستان کی زبان ہے۔ اردو زبان تمام مذاہب کے ماننے والوں اور سبھی فرقوں کی زبان ہے۔ کوئی بھی زبان کسی خاص مذہبی فرقے کی نہیں ہوسکتی۔ اردو زبان ہندستانی تہذیب اور اس کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔'' مرلی منوہر جوشی بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر بھی رہ چکے ہیں جس کے اکثر لیڈروں کے ذہن اردو زبان کے بارے میں صاف نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود مرلی منوہر جوشی نے بحیثیت اہم مرکزی وزیر کے جب اردو کو مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندستان کی زبان قرار دے کر اردو والوں سے اپیل کی کہ وہ اس زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے دیانتدارانہ کوششیں کریں تو صاف نظر آرہا ہے کہ سوچ بدل رہی ہے اور ایک نئی تاریخ قلمبند کی جارہی ہے۔

مرلی منوہر جوشی کے سیاسی نظریات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے ان کی تعلیمی پالیسی پر زبردست اعتراض بھی ممکن ہے اور معقولیت پسند اس پر شدید نکتہ چینی بھی کرتے رہے ہیں۔ لیکن جب وہ اردو زبان کے بارے میں شکوک وشبہات مٹاتے ہوئے اعلان کرتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندستان کی زبان ہے تو خود اردو والوں کو اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ذہنوں کو صاف کرنا چاہیے۔ اردو کو مسلمان بنا کر اس زبان کے ساتھ جو ناانصافی کی گئی ہے اس کے لیے اردو مخالف اور اردو حامی بھی مجرم ہیں۔ کئی بار مختلف سیمناروں میں اگر کسی سرپھرے نے اس پر احتجاج بھی کیا تو اس کو اقلیت دشمن قرار دیا گیا۔ اردو مسلم اقلیت کی زبان نہیں ہے بلکہ لسانی اقلیت کی زبان ہے لیکن اس نظریے کو تسلیم نہ کرکے ہم سبھوں نے اس کو قومی دھارے سے الگ تھلگ کردیا۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ آج نہ تو اردو کی اچھی کتابوں کے بازار میں خریدار ہیں نہ اردو اخبارات کی اشاعت چند ہزار کاپیوں سے زیادہ ہے۔ مانا کہ اردو اخبارات معیار اور نیوز اور ویوز کے لحاظ سے انگریزی، ہندی اور ریجنل زبانوں کے اخبارات کا مقابلہ نہیں کرسکتے لیکن اس کے لیے اردو پڑھنے والے خود ذمے دار ہیں جو اردو اخبارات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔

وزیر برائے فروغ انسانی وسائل مرلی منوہر جوشی کی نیت پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ انھوں نے اردو کو ہندستان کی زبان قرار دینے کا اعلان بند کمرے میں سرگوشیوں میں نہیں کیا ہے بلکہ اردو کے دانشوروں اور پروفیسروں کے کھلے اجلاس میں اس وقت کیا جب راجدھانی میں پہلی بار اردو زبان کو بسانے کے لیے اس کے اپنے گھر کی تعمیر کا سنگ بنیاد جسولہ گاؤں میں رکھا گیا۔ انھوں نے اردو زبان کے فروغ کے لیے مختلف اسکیموں کا اعلان کرتے ہوئے اردو والوں کو دعوت دی کہ وہ آگے آئیں اور اس زبان کی تاریخی حیثیت کو بحال کریں۔ مرلی منوہر جوشی بی جے پی کے سینیر لیڈر ہیں جس کی وجہ سے مایوسی کے پیغمبران کے اس اعلان کو چناؤ سیاست قرار دے سکتے ہیں۔ وقت آیا ہے کہ جوشی جی کے اعلان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مایوسی کے پیغمبر اردو کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنے کی طرف توجہ دیں۔ اردو اکادمیوں اور اردو کی تنظیموں کو بھی اپنی جاگیردارانہ ذہنیت میں بدلاؤ لاکر مرلی منوہر جوشی کی دعوت کا خیر مقدم کرتے ہوئے اردو زبان کو قومی دھارے میں واپس لانے کی طرف تمام تر توجہ دینی چاہیے۔

(بشکریہ ''اداریہ قومی آواز''، نئی دہلی، 19 رفروری 2004)

مُرلی منوہر جوشی

فروغ اردو کے سفر میں میرے پانچ سال

عزت مآب ڈاکٹر زکریا صاحب، گلزار صاحب، شہاب الدین صاحب، جوائنٹ سکریٹری شری پانڈے جی، شریمتی بیلا بنرجی، ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ صاحب اور حاضرین جلسہ۔ مجھے آج بے حد خوشی ہے کہ آپ سب کے ساتھ اس موقعے پر اردو کونسل کی اپنی عمارت کا سنگِ بنیاد میں اپنے ہاتھوں رکھ سکا۔ اور سب سے خوشی کی بات یہ کہ اس میں زکریا صاحب تشریف لائے۔ مجھے کبھی کبھی یہ ڈر لگنے لگتا ہے کہ وہ اپنی صحت کی وجہ سے یہ نہ کہہ دیں کہ اس بار معاف کیجیے۔ لیکن مجھے بے حد خوشی ہے کہ وہ یہاں آئے۔ شہاب الدین صاحب یہاں آئے اور آپ سب حضرات یہاں تشریف لائے۔ دور دور سے، جتنی بھی ہماری صوبائی اردو اکادمیاں ہیں، سب کے نمائندے یہاں آئے۔ یہ بہت ہی خوشی کا موقع ہے۔ اردو والوں کے لیے بھی، کونسل کے لیے بھی اور اس کے صدر کی حیثیت سے میرے لیے بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ میں قومی اردو کونسل اور اردو والوں کا مشکور ہوں کہ انھوں نے یہ کام میرے ہاتھوں سے کرایا، ورنہ یہ کوئی بھی کرسکتا تھا لیکن یہ ان کا میرے ساتھ جو تعلق ہے، سمبندھ ہے یہ اس کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اس کام کو آج ہی، انھی دنوں کرانے کا فیصلہ کیا۔

پچھلے پانچ سال میں اردو کونسل نے ایک نئے وژن کے ساتھ کام کیا ہے۔ یہ وژن نہ صرف اردو کی ہندستانی جڑوں کی پہچان کا ہے بلکہ اردو کو ہندستان کی بہو بھاشی حقیقتوں سے جوڑنے کا بھی ہے۔ پچھلے چند برس میں قومی پہچان کو عام ہندستانی نے نئے انداز میں محسوس کرنا شروع کیا ہے اور اس سے ہم آہنگ ہونے اور وقت کے دھارے کے ساتھ چلنے کے لیے ہندستان کے بہو بھاشی منظرنامے میں اردو کی جڑوں کی کھوج ضروری ہے۔ کیوں کہ زبانیں تنِ تنہا یا علاحدگی میں نہیں پنپ سکتیں۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ بھاشائیں سبھیتا اور سنسکرتی کا سب سے اہم حصہ ہیں، ان کے اظہار کا سب سے اہم وسیلہ۔ اب اگر تہذیبی حوالے سے زبانوں کی کھوج کی بات کی جائے تو اس میں کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ سبھی زبانوں کو اپنی جڑوں کی طرف دیکھنا ہوگا۔ تبھی وہ مہان بھارت کی راشٹریہ ایکتا کی صحیح تصویر پیش کرسکیں گی۔ جیسے دنیا بھر کی دوسری زبانیں اپنے اپنے علاقوں میں اپنی قومی پہچان کا وسیلہ بنتی ہیں، اس حوالے سے اردو کی جڑوں کی کھوج کی یہ کوشش جس کے عملی اقدام قومی اردو کونسل نے کیے ہیں، بہت اہم اور تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ زبانوں کا جغرافیہ بھی ہوتا ہے اور وہ جغرافیہ سے کافی حد تک پربھاوت ہوتی ہیں۔ مثلاً ریگستان میں رہنے والے جو لوگ ہیں، اگر آپ ان کے ادب کو دیکھیں گے تو اس میں برف کا ذکر نہیں ملے گا اس میں سدابہار پیڑوں کا ذکر نہیں ملے گا۔ اس میں ریت، اونٹ اس قسم کے اذکار ملیں گے جو اس کی طرف اشارہ کرتے ہوں گے کہ وہ کس جغرافیہ سے جڑے ہیں لیکن اگر کوئی سائبیریا یا ٹنڈرا میں رہتا ہوگا تو اس کو ریت کا منظر سمجھ میں نہیں آئے گا۔ وہ برف کی بات کرے گا۔ وہ کچھ سدابہار پیڑوں کی اور کچھ ہمیشہ پتے جھڑنے والے پیڑوں کی بات کرے گا۔ وہ خیموں کی بات کرے گا۔ تمبوؤں کی بات کرے گا۔ لیکن وہ گائے کی بات نہیں کرسکے گا، وہ اونٹ کی بات نہیں کرے گا۔ کیرالہ میں رہنے والا جو فنکار ہے، ادیب ہے کیرالہ کے جغرافیہ سے جڑا ہوتا ہے تو اس طرح ادب یا ساہتیہ بھوگول سے جڑتا ہے۔ اور اردو کا بھوگول ہندستان ہے۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ اردو کا، ہندی کا، ان سب کا جغرافیہ ہندستان ہے۔ اس لیے جو اردو کا ساہتیہ ہوگا، ادب ہوگا اس میں ہندستانیت، ہندستان کا جغرافیہ، ہندستان کی تہذیب، ہندستان کی جل وایو، یہ سب ہمیں دیکھنے کو ملے گا۔ اور وہ ملنا چاہیے، اگر کوشش یہ ہو کہ اردو میں اور دوسرے جغرافیوں کو Importance دی جائے تو وہ اردو کو آگے نہیں لے جائیں گے۔ دنیا کے تمام جغرافیہ سے ہم جڑے ہیں اس

● 14/فروری 2004 کو جسولہ، کالندی کنج روڈ (نزدیک اپولو اسپتال) میں قومی اردو کونسل کی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد مرکزی وزیر برائے فروغِ انسانی وسائل ڈاکٹر مُرلی منوہر جوشی نے رکھا۔ اس موقعے پر انہوں نے جو تقریر کی، اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے قارئینِ "اردو دنیا" کی نذر کیا جارہا ہے۔ ادارہ

میں کوئی شک نہیں ہے، اس کے تھوڑے بہت اثرات آئیں گے بھی لیکن جو اس کا جزو خاص ہے، جو اس کا سار ہے وہ ہندستان کا جغرافیہ ہونا چاہیے۔

ایک بار شرت چندر چٹرجی سے جو بنگلہ کے بہت بڑے ساہتیہ کار تھے، کسی نے پوچھا کہ شرت بابو جو آپ کے کردار ہیں۔ آپ کے ناولوں میں، آپ کی کہانیوں میں وہ سب بنگال کے گاؤں کے اردگرد گھومتے ہیں اور آپ نے ناری کا بہت زبردست چترن کیا ہے مگر وہ سب مہیلائیں بنگال کے گاؤں کی مہیلائیں ہیں، لیکن جو بات آپ کہہ رہے ہیں اس میں، وہ تو ساری دنیا پر لاگو ہوتی ہے۔ وہ گلوبل ہے۔ یونیورسل ہے مگر آپ کا پریویش، آپ کا جغرافیہ، یہ صرف بنگال اور اس کا گاؤں ہے، آپ اس سے نکلیے۔ تو جو بات شرت چندر بابو نے کہی تھی وہ آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا تھا:

''میں اپنے اس گاؤں کے ذریعے بنگال سے جڑتا ہوں اور بنگال کے ذریعے ہندستان سے جڑتا ہوں اور ہندستان کے ذریعے میں دینا سے جڑتا ہوں۔ اگر میں اپنے اس گاؤں کو بھول جاؤں گا تو بنگال سے کس راستے سے جڑوں گا۔ یہ میرا گاؤں ہے جو مجھے دنیا سے جوڑتا ہے۔ اگر ہمیں دنیا کے جغرافیے سے اپنے آپ کو جوڑنا ہے تو ہمیں اپنی زمین کے جغرافیے سے، آس پاس کے جغرافیے سے جڑنا ہوگا۔ بنا اس کے کوئی مستقل اور مکمل ادب پیدا نہیں ہوسکتا۔''

ہمارے آئین میں دیش کے سبھی ورگوں کی آرزوؤں اور امنگوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ جس کے نتیجے میں میل ملاپ کی جو تصویر ابھرتی ہے اس سے بھارت کی ایکتا اور اکھنڈتا کو مضبوطی ملے گی۔ اجنتا، ایلورا، تاج محل اور لال قلعہ ہماری ساجھی دھروہر ہیں اور ہندستان کے سبھی ناگرک اس ساجھی دھروہر کے امین۔ چاہے وہ کسی مذہب کے ماننے والے ہوں۔ جس طرح سے دیش کا کوئی بھی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ اجنتا ایلورا اس کے نہیں ہیں اسی طرح کوئی ہندو بھی یہ کہنے کی ہمت نہیں کرسکتا کہ تاج محل اس کا نہیں ہے۔ زبانوں کی اُنّتی کے لیے پالیسی سازی کے علاوہ ضرورت ایسی مشنری کی ہوتی ہے جو پالیسی کو لاگو کرسکے۔ اردو کے لیے ایسی مشنری موجود نہیں تھی۔ اس لیے اردو کی اجلی تصویر ابھر کر سامنے نہیں آرہی تھی۔ ہم نے پہلی بار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو سرکار کے اعلا ادارے کی شکل میں مانیتا دی اور اسے اردو زبان و تعلیم کے فروغ کے لیے نوڈل ایجنسی بنایا۔ جو مختلف ریاستوں، ریاستی اردو اکادمیوں اور دیگر تعلیمی اداروں کے بیچ نیٹ ورکنگ کرکے اردو کے وکاس کی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنا رہی ہے اور اردوداں طبقے کو ایک نئی دنیا دے رہی ہے۔ کونسل نے جس منصوبہ بند طریقے سے اردو تعلیم کو قومی لکشیوں اور اعلا معیار تک لانے کی کوشش کی ہے اس سے ہماری سرکار کا یہ کمٹمنٹ واضح ہوجاتا ہے کہ ہم بھارت کو خوش حال بنانے کے لیے ہر طبقے اور ہر ورگ کے لوگوں کو تعلیمی طور پر آگے بڑھانے کے لیے وچن بدھ ہیں۔ پچھلے پانچ سال میں سادھنوں کی کمی کے باوجود قومی اردو کونسل کو جو بجٹ مہیا کیا گیا اور جو پربھاؤ شالی ڈھنگ سے اردو زبان کے فروغ اور تعلیم کے لیے خرچ ہوا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرکار نے ووٹ بینک کی سیاست سے اوپر اٹھ کر اردو کے وکاس کے لیے دیانت داری اور نیک نیتی سے کام کیا۔ یہ بات خوشی کی ہے کہ اردو عوام کے سنجیدہ حلقے اس کام سے مطمئن ہیں۔ کونسل نے اپنی تشکیل کے دن سے ہی اردو زبان و ادب کے وِکاس کے کام کو ایک مشن کے طور پر انجام دیا ہے۔ اور آج اسی کوشش کا نتیجہ ہے کہ کونسل کا بجٹ 84 لاکھ سے بڑھ کر 11 کروڑ ہوگیا ہے اور ہر شعبے میں اردو کی Visibility بڑھی ہے اور اس سلسلے میں میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گا ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب کا جنھوں نے کونسل کے کام کی تعریف کی اور کچھ میرے بارے میں بھی بہت اچھی باتیں کہیں۔ یہ ان کا میرے اوپر پرانا سنیہ ہے، آج کا نہیں ہے۔ زکریا صاحب کا آشیرواد مجھے ہمیشہ سے ملتا رہا ہے۔ یہ ان کا بڑپّن ہے کہ انھوں نے اس چھوٹے سے کام کے بارے میں اتنی وِشالتا سے، اتنی فراخدلی سے کچھ باتیں کیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ابھی اور کام ہونا چاہیے۔ یہ ابھی شروعات ہے۔ ابھی تو آج اس کی بنیاد پڑی ہے۔ آگے جب تعمیر ہوگی تو پتہ لگے گا کہ کام اور کتنا چلے گا۔

میرا نظریہ یہ ہے کہ جدیدکاری کا عمل زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ ہماری زبانوں کو اپنی اُنّتی کے لیے وہ سارے سادھن مہیا ہوں جو آج کی زندگی کی ضرورت ہیں تو یہ زبانیں جیون کے ہر چھیتر کے لوگوں کو پربھاوت کریں گی۔

اردو کونسل کے ذریعے میرے منترالے نے پچھلے پانچ سال میں کئی اہم قدم اٹھائے۔ بھارت میں پہلی بار آزادی کے بعد اردو کی اُنّتی

اور جدیدکاری کے لیے اسے انفارمیشن ٹیکنالوجی سے جوڑنے کی کامیاب کوششیں کی گئیں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اردو عوام اور اردو سے وابستہ ساہتیہ کاروں، بدھی جیویوں اور اسکالروں نے ان کوششوں کی سراہنا کی ہے۔ سرکار نے وقت کی اہم ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اردو سے جڑے سماج کو آگے لانے کے لیے انفارمیشن ٹیکنالوجی میں تعلیم کے مراکز کھولنے کی اسکیم شروع کی۔ اردو کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کونسل نے چار سال پہلے ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ ٹی۔ پی شروع کیا۔ اسے بے حد کامیابی ملی ہے۔ اس کے تحت ابھی تک 150 کمپیوٹر تربیتی مراکز 22 صوبوں کے 97 ضلعوں میں کھولے جا چکے ہیں۔

گذشتہ پانچ برس کے دوران 150 کمپیوٹر مراکز قائم کرنے کے لیے 2404.24 لاکھ روپے مہیا کیے گئے ہیں اور رواں سال میں 700.00 لاکھ روپے اسی مقصد کے لیے مہیا کیے گئے ہیں۔ اگلے مالی سال میں 50 نئے سینٹر کھولنے کی تجویز ہے اور اس طرح ایسے مراکز کی تعداد 200 ہو جائے گی۔

رانچی، لکھنؤ، حیدرآباد، سرینگر، امروہہ اور بنگلور کے سینٹر صرف لڑکیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اب تک 16397 طالب علموں نے انفارمیشن ٹیکنالوجی میں تعلیم حاصل کی جس میں 40% مسلم لڑکیاں بھی شامل ہیں، اور 60 فی صد سے زیادہ بچوں کو روزگار حاصل کرنے میں کامیابی ملی ہے۔ 04-2003 کے سیشن کے ساتھ اب ہر سال تقریباً 9000 طلبہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کریں گے۔ اس اسکیم نے گویا دو دو کامیابیاں حاصل کیں: اردو داں طبقے کے بے روزگار نوجوانوں کی روزگار مرکوز تربیت شروع کی اور اردو زبان کو موجودہ دور کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے کا کام بھی شروع کیا۔ حال ہی میں ڈپلوما کورس کا نصاب DOEACC سوسائٹی کے تعاون سے وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر بہتر کیا گیا ہے۔ ہم نے NCERT کو ہدایت دی ہے کہ جیسے ہی وہاں کتابیں تیار ہوں، ان کا ترجمہ اسی وقت اردو میں کروانے کی کوشش کی جائے اور کافی سے زیادہ اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ نیشنل اوپن اسکول کی جتنی کتابیں ہیں وہ بھی اردو کے ذریعے بازار میں ہیں۔ ان کے پرچے بھی اردو میں ہوتے ہیں اور اردو کے ذریعے اوپن اسکول سے کوئی بھی بچہ تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ اس میں پیسے کا کوئی خرچ نہیں ہے۔ کوشش یہی ہے کہ ہر راستے سے ہم ہندستان میں تعلیم کو پھیلائیں۔ کونسل نے نئے سافٹ ویئر ڈیولپمنٹ پر بھی توجہ دی ہے اور مجھے امید ہے کہ اگلے مالی سال میں اردو کا ایسا سافٹ ویئر سامنے آ جائے گا جو انٹرنیٹ کی ضروریات کو بھی پورا کرے گا۔

اردو زبان اور اردو والوں کو جدید کاری کے عمل سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں سرکار نے دوسرا اہم قدم خطاطی اور گرافک ڈیزائن میں دو سالہ ڈپلوما کورس شروع کر کے اٹھایا ہے۔ خطاطی ہماری تہذیبی وراثت کا ایک اہم حصہ ہے لیکن کمپیوٹر سافٹ ویئر کے فروغ کے ساتھ خطاطی اور کتابت جیسے فن کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ کاتبوں کو روزگار ملنا تقریباً بند ہو گیا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اگر کتابت اور خطاطی کے فن کو گرافک ڈیزائن اور کمرشیل آرٹ سے جوڑ دیا جائے تو یہ فن بھی محفوظ رہے گا اور کاتبوں کو روزگار حاصل کرنے کے خوشگوار مواقع بھی ملیں گے۔ اس سمجھ کے ساتھ ہی کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن میں یہ ڈپلوما شروع کیا گیا ہے جس میں گرافک ڈیزائن، کمرشیل آرٹ اور کمپیوٹر تعلیم لازمی کر دی گئی ہے تاکہ اوسط درجے کی مہارت رکھنے والے عام طالب علم بھی الیکٹرونک میڈیا اور ایڈورٹائزمینٹ مارکیٹ میں روزگار کے بہتر مواقع حاصل کر سکیں۔ کونسل نے یہ ڈپلوما اپریل 2001 میں شروع کیا تھا۔ اس کے تحت ابھی تک 23 کیلی گرافی اینڈ گرافک ڈیزائن سینٹر 12 صوبوں میں کھولے جا چکے ہیں۔ 625 طالب علم ان مراکز میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اگلے مالی سال میں 12 نئے سینٹر کھولنے کی تجویز ہے اور ایسے مراکز کی تعداد 23 سے بڑھ کر 35 ہو جائے گی۔ رواں سال میں اس مقصد کے لیے 25.00 لاکھ روپے فراہم کیے گئے ہیں۔

ملک میں اردو ٹائپسٹوں اور اسٹینو گرافروں کی مانگ کو پورا کرنے کے لیے قومی اردو کونسل رضا کار تنظیموں کے اشتراک سے اردو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ تربیتی مراکز قائم کرنے اور چلانے کی اسکیم بھی چلا رہی ہے۔ ملک کے بدلے ہوئے منظرنامے میں یک لسانی تکنیکی مین پاور قابلِ روزگار نہیں ہے۔ اس لیے ایک نیا کورس کثیر لسانی ٹائپ اینڈ شارٹ ہینڈ (اردو، ہندی اور انگلش) شروع کیا گیا ہے تاکہ اردو بولنے والوں میں سے تکنیکی مین پاور پیدا کیا جا سکے۔ جن کے لیے روزگار

تلاش کرنا آسان ہو جائے گا۔ اگلے مالی سال میں 20 نئے سینٹر کھولنے کی تجویز ہے اور ایسے مراکز کی تعداد 25 ہو جائے گی۔

کونسل مدرسوں کی جدید کاری کے پروگرام میں ایک اہم رول نبھا رہی ہے۔ اس کے تحت سائنس، حساب اور سماجی علوم کی کتابیں تیار کی گئی ہیں جو سبھی ریاستوں بالخصوص اتر پردیش، مدھیہ پردیش، بہار، اڑیسہ اور مغربی بنگال میں کافی مقبول ہوئی ہیں۔ قومی اردو کونسل کی سب سے نمایاں کامیابی یہ ہے کہ اس نے مدرسوں کے لیے جدید مضامین کا نصاب بنانے اور کتابیں مہیا کرانے کے ساتھ کمپیوٹر تعلیم کو مدارس کے بچوں تک پہنچایا ہے۔ مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے والے زیادہ تر بچے بہت غریب اور پچھڑے طبقے سے آتے ہیں اور ابھی نئی زندگی کی نئی سوغاتوں سے محروم ہیں۔ کمپیوٹر تعلیم ان کو نئی زندگی سے ہم آہنگ ہونے اور نئے تعلیمی منظر نامے کا حصہ بنانے میں بڑی مددگار ثابت ہو رہی ہے۔ مدرسوں تک جدید تعلیم پہنچانے کا غالباً یہ سب سے بہتر اور آسان طریقہ ہے اور آزاد ہندستان میں اس جانب پہلا قدم بھی۔

اردو کی ترقی سے جڑا ایک اہم پہلو اردو کی اپنی لپی کو سکھانے کا ہے۔ یہ اندیشہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ اردو لپی جو ایک خوبصورت نقش بھی ہے، خطرے میں پڑ گئی ہے۔ اردو لکھنے اور پڑھنے والے لوگوں کے علاوہ ہمارے ملک میں ایک بہت بڑا طبقہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو اردو شعر و ادب پڑھنا چاہتا ہے۔ اردو ادب کے سرمایے کو عام کرنے کے لیے اسے دیوناگری رسمِ خط میں چھاپنے کی ضرورت تو ہے ہی لیکن جو لوگ اردو رسمِ خط میں اسے پڑھنا چاہتے ہیں، انھیں اردو سکھانے کے لیے مواقع فراہم کرنا بھی قومی اردو کونسل کی ذمے داری ہے۔ اسی مقصد کے تحت قومی اردو کونسل نے ہندی اور انگریزی کے ذریعے اردو سکھانے کا ایک سالہ مراسلاتی ڈپلوما کورس شروع کیا ہے۔ اس کورس کے تحت چھ کتابوں کا ایک نصابی سیٹ تیار کیا گیا ہے۔ معاون کتابوں میں مشہور و معروف مصنف اور شاعر گلزار کی تحریر کردہ پچ تنتر پر مشتمل آڈیو کیسٹس بھی فراہم کی جاتی ہیں۔ اردو سیکھنے والوں کی اس فہرست میں مرکزی وزیرِ خزانہ شری جسونت سنگھ کے علاوہ فلمی دنیا کی کئی معروف شخصیات بھی شامل ہیں۔ اب تک 5569 اردو سیکھنے والوں کو سرٹیفکیٹ تقسیم کیے جا چکے ہیں جن میں 3739 لڑکے اور 1830 لڑکیاں ہیں۔ 04-2003 کے دوران کل 11000 داخلے ہوئے ہیں جن میں 6854 لڑکے اور 4146 لڑکیاں ہیں۔ اس میں لپی کے معاملے پر ہمیشہ ایک دھیان دینے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اردو ساہتیہ، اردو ادب ہندستان کے کونے کونے میں پہنچے، انھیں اردو ساہتیہ دیوناگری میں بھی لانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ بڑا بازار آپ کے لیے اُپلبدھ ہوگا۔ بہت لوگ اس سے آپ کی چیزوں کو پڑھیں گے۔ بہت لوگ اردو کی شعر و شاعری اور اردو کے ادب سے واقف ہونا چاہتے ہیں لیکن لپی سیکھنا، آخر کتنی لپی آدمی سیکھے؟ اس کے سامنے مشکل آ کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن اگر دیوناگری میں بھی چیزیں آجائیں جیسا ابھی بتایا گیا تو اردو کے تمام پرانے شاعروں کی جتنی بھی شاعری ہے وہ جن لوگوں نے دیوناگری میں پڑھی ہے انھوں نے آگے اس پر جو ریسرچ کی ہے، وہ ان لوگوں سے کہیں بہتر تھی جنھوں نے اردو یا فارسی میں پڑھی ہے۔ اس میں یہ خطرہ نہیں ہے کہ اردو کی لپی ختم ہو جائے گی۔ وہ تو ختم نہیں ہو سکتی لیکن اردو پڑھنے والوں کا دائرہ اور وسیع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ دیوناگری میں بھی اردو کے ساہتیہ کو چھاپیں، لکھیں، پڑھیں اور اس سے آپ کا، اردو کا وستار ہوگا۔ لوگ اردو کو پسند کرتے ہیں مگر لپی سیکھنے کی زحمت بہت سے لوگ نہیں اٹھا سکتے۔ جو اردو کی لپی میں پڑھنا لکھنا چاہتے ہیں شوق سے پڑھیں، لکھیں اس میں کسی طرح کا روڑا نہیں ہے، اس میں پوری سہولتیں ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کرنا ضروری ہے۔ میرے پاس بوڈوز آئے تھے جنھوں نے کہا ہماری language سمویدھان میں ہونی چاہیے۔ میں نے کہا ضرور کریں گے۔ لیکن آپ لکھیں گے کس میں؟ اگر آپ کوئی پرانی ٹرائبل لپی لائیں گے تو آپ کو لکھنا، پڑھنا، بتانا بہت دشوار ہو جائے گا۔ لیکن اگر آپ کوئی واقعی لپی اپنی سویکار کرلیں، اسمیا سویکار کرلیں یا بنگلہ سویکار کرلیں یا دیوناگری سویکار کرلیں تو آپ کا ساہتیہ ہم لوگ بھی پڑھ سکیں گے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے دیوناگری accept کرلی۔ اسی طرح سے اروناچل والوں نے دیوناگری accept کرلی۔ آج وہاں آنا جانا اور ان لوگوں کو نوکریوں کے سلسلے میں ہندستان کے ہر حصے میں پہنچنا آسان ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ Bodo language ختم ہو جائے گی۔ ختم ہونے کا سوال ہی نہیں۔ کوئی بھاشا جسے لوگ بولیں گے، جسے استعمال میں لائیں گے اور جوان کی روزی اور روٹی کے ساتھ جڑ جائے گی وہ ختم

نہیں ہوگی۔ اور میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جتنی بھی بولیاں ہیں، بھاشائیں ہیں ہندستان میں، وہ سب آگے بڑھیں اور پنپیں۔ کیونکہ یہ جو diversity ہے، جو وِودھتا ہے وہ ہمارے ملک کی ہی نہیں بلکہ دنیا کی پہچان ہے۔ اگر سب لوگ ایک ہی زبان بولنے لگیں، سب لوگ ایک سے ہی کپڑے پہننے لگیں، سب کے ناک نقشے ایک سے ہی ہوجائیں تو میرا خیال ہے اس دنیامیں رہنے کا مزہ کرکرا ہوجائے گا۔ یہ diversity ہونا ضروری ہے۔ یہ خوبصورتی ہے۔ چمن میں طرح طرح کے پھول ہونا ہی چاہیے۔ سارے ہندستان کے باغوں میں صرف ایک قسم کے پھول ہوں، ایک ہی قسم کے درخت ہوں تو آپ اوب جائیں گے۔ جسے انگریزی میں کہتے ہیں bore ہوجائیں گے۔ لیکن دنیا کو اگر bore ہونے سے بچانا ہے تو ضروری ہے کہ دنیا میں diversity ہو، وِودھتا رہے۔ یہی خوبصورتی ہے۔ اور یہ جتنی بھی کائنات ہے، ہم دیکھتے ہیں طرح طرح کی، مختلف چیزیں ہیں۔ رنگ روپ، بھاشا، بھوجن یہ سب الگ الگ ہیں تو یہ الگاؤ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ہی ستیہ کا طرح طرح سے پرکٹکرن ہے۔ ایک ہی چیز ہے جو الگ الگ طرح سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ تو اس لیے زبانیں جتنی زیادہ ہوں گی، اتنی ہی اچھی طرح سے ایک چیز کو کسی زبان میں، دوسری چیز کو کسی زبان میں ہم بول سکیں گے۔ لکھ سکیں گے، سمجھ سکیں گے، اس سے سمجھ داری بڑھتی ہے، وہ پھیلے، وہ سب کے پاس پہنچے جو ہم کہنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپسی آدان پردان ہو اور یہ موقع اس لیے اچھا ہے کہ جیسا ابھی وہاں اندر ذکر ہورہا تھا کونسل کی میٹنگ میں کہ آخر ہندستان کی زبانوں میں سب سے زیادہ نزدیکی تو ہندی اور اردو میں ہے۔ تو وہ اور بڑھ سکتی ہے۔ اگر ایک دوسرے کا ساہتیہ ہم سمجھیں۔ اس لیے میں نے یہ بھی کہا تھا جو لوگ ہندی میں لکھتے ہیں ان کی کتابوں کو آپ اردو میں بھی شائع کریں تاکہ اردو زبان پڑھنے والوں کو یہ پتہ لگ سکے کہ ہندی میں کیا ہورہا ہے، بنگلہ میں کیا ہورہا ہے، مراٹھی میں کیا ہورہا ہے اور وہ سمجھ سکیں کہ بھئی کیسے کیسے وِچار، کیسے کیسے خیال اور کیسے کیسے فنکار ہمارے دیش میں موجود ہیں۔ اردو لپی سے ناواقف لوگوں تک اردو کا کلاسیکی سرمایہ پہنچانے کے لیے قومی اردو کونسل وچن بدھ ہے اور کونسل نے یہ طے کیا ہے کہ کلاسیکی text کو اردو کے ساتھ دیوناگری میں شائع کیا جائے۔ اس سلسلے میں کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی کی پہلی جلد اور سورداس کے روحانی نغمے کا وموچن آج کیا جائے گا۔ کلیاتِ اکبر چالیس سال پہلے الٰہ آباد سے دیوناگری میں پنڈت پدم کانت مالوی جی کے ذریعہ شائع ہوا تھا۔ اکبر چونکہ الٰہ آباد سے تھے اس لیے ان کے ساہتیہ سے میرا لگاؤ بھی زیادہ ہے۔ پڑھا بھی بہت ہے اس میں جو وینگیہ ہے، جو satire ہے وہ بہت چٹکلہ ہے اور بہت موقعے کا ہے اور آج بھی اتنا ہی سارتھک ہے، اتنا ہی relevant ہے جتنا اس زمانے میں تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ یونیورسٹی کے لڑکے کئی بار اپنی ڈگریاں لکھ کر بھیجتے ہیں۔ ایک کارڈ چھاپتے ہیں اس میں اپنی لمبی چوڑی ڈگریاں لکھتے ہیں۔ ایک لڑکا اکبر صاحب سے ملنے گیا، تازہ تازہ بی اے پاس ہوا تھا، اس زمانے میں بی اے پاس کو نوکری بہت جلدی مل جاتی تھی تو اس نے اپنا نام لکھا اور ساتھ میں بی اے بھی لکھ دیا۔ خیر! اکبر اندر کچھ کام کررہے تھے وہ نہیں آئے باہر اور بلایا بھی نہیں۔ آدھا گھنٹہ ہوگیا، گھنٹہ ہوگیا۔ اس نے پھر اپنا نام لکھا اور بی اے ذرا نمایاں لکھ دیا تاکہ دیکھیں کہ بی اے پاس لڑکا وہاں موجود ہے۔ پھر بھی نہیں آئے۔ بلایا بھی نہیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے جھنجھلا کر پھر ایک پرچہ بھیجا تو انھوں نے اس میں لکھا:

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور ایسا لکھ دیا
آپ بی اے پاس ہیں تو ہم بھی بی بی پاس ہیں

کتنا سرل ہے، کتنا meaningful ہے اس کو بتا دیا کہ ہر چیز کی اہمیت ہے۔ اپنی جگہ پر رہو۔ اس لیے اس میں بہت مصلحت ہے۔ یہ ایک عجیب چیز ہے۔

اردو پروموشن قومی اردو کونسل کی ایک اہم سرگرمی ہے جس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قومی اردو کونسل نے 2000 میں دلی میں لال قلعہ میدان پر کل ہند اردو کتاب میلہ منعقد کرکے جو تجربہ کیا تھا، آج وہ اردو کتابوں کی نمائش و فروخت کا اہم ذریعہ بن چکا ہے۔ پہلے کتاب میلے کی شاندار کامیابی کے بعد کونسل اب تک پانچ کل ہند اردو کتاب میلے منعقد کرچکی ہے۔ پہلے اور دوسرے کتاب میلے کا انعقاد 2000 اور 2001 میں دلی کے لال قلعہ میدان میں کیا گیا۔ جبکہ تیسرا 2002 میں ممبئی میں اور چوتھا 2003 میں سری نگر میں اور پانچواں کتاب میلہ 2004 میں ممبئی میں منعقد کیا گیا۔ ان تاریخی کتاب میلوں میں مختلف ریاستی اردو اکادمیوں اور متعدد ناشرین و تاجران کتب نے شرکت کی۔ ان کتاب میلوں کے دوران متعدد ثقافتی اور تعلیمی پروگراموں کا انعقاد بھی عمل میں آیا۔ اس

کامیاب تجربے سے ہماری اتنی حوصلہ افزائی ہوئی کہ اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کتاب میلے کم سے کم سبھی سارک ممالک میں منعقد کیے جائیں گے۔ اردو کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر ملک میں اردو کتابوں کا Display ہوا۔ پچھلے پچاس سال میں یہ ایک نیا تجربہ ہوا۔ کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک اردو کتابیں مہیا ہوئی ہیں۔ ان کتابی میلوں سے نہ صرف اردو کی Visibility بڑھی بلکہ اردو کتابوں کی نکاسی کے لیے نئے میدان بھی تلاش کیے گئے۔ اردو کتابوں کو اردو قارئین کے دروازے تک پہنچانے کے لیے اور یہ شکایت دور کرنے کے لیے کہ اردو بولنے والوں کے علاقے تک اردو کتابیں نہیں پہنچ پاتیں، ایک موبائل بک وین شروع کی گئی ہے جس نے اتر پردیش، بہار، جھارکھنڈ، پچھمی بنگال، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اور جموں و کشمیر کے مختلف حلقوں کا دورہ کیا ہے۔ اس کوشش کے بہت اچھے اور حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے ہیں۔ موبائل وین کے مادھیم سے اردو قارئین و شائقین میں بڑا جوش و خروش پیدا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو جاری رہے گا۔

اردو صحافت کا جنگِ آزادی میں، سماجی استحکام میں اور فرقہ وارانہ میل جول کے عمل کو قومی دھارا سے جوڑنے میں بہت اہم یوگدان رہا ہے۔ جس کے پیشِ نظر میرے منترالے نے اردو پریس کو تقویت بخشنے کے لیے بامعنی اقدامات کیے ہیں اور UNI کی اردو سروس سے فائدہ اٹھانے کے لیے چھوٹے اور درمیانی درجے کے اردو اخباروں کو مالی تعاون دیا ہے۔ اسکیم کی مدد سے اردو پریس میں خبروں اور خیالات کو ہم آہنگ کرنے میں کافی مدد ملی ہے۔ اس طرح سے اردو پریس کو قومی دھارا سے جوڑنے کا اہم پروگرام ہے۔ UNI نے اپنی ٹیلی پرنٹر سروس کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔ جس تک رسائی کمپیوٹر پر خصوصی طور سے تیار کیے گئے سافٹ ویئر کی مدد سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ پورے ملک کو اس سسٹم کے ذریعے جوڑنے کی کوشش کی گئی تاکہ ملک کے اردو اخبارات متعدد معاملات پر نئی اطلاعات کی روشنی میں نئے عہد کی عکاسی کرسکیں۔ فی الحال 44 اردو اخبارات UNI کی اردو سروس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور پچھلے پانچ سال میں اردو ٹیلی پرنٹر سروس سے فائدہ اٹھانے والے اخباروں کی طرف سے 24.96 لاکھ روپے بطور سبسڈی UNI کو جاری کیے گئے ہیں۔ اور رواں مالی سال میں اسی مقصد کے لیے 25 لاکھ روپے فراہم کیے گئے ہیں۔

ہندستانی سبھیتا اور سنسکرتی کی اُنتی میں عربی اور فارسی زبانوں کے رول کو صحیح تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ عربی اور فارسی ہماری ثقافت کی وہ اہم زبانیں ہیں جنھوں نے ہندستان کی سبھیتا اور سنسکرتی کی انتی میں تاریخی رول ادا کیا ہے۔ اس کے پیشِ نظر قومی اردو کونسل ان زبانوں کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ اس اسکیم کے تحت قومی اردو کونسل مختلف مکاتب و مدارس کو جزوقتی اساتذہ کی تنخواہ اور دیگر علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے مالی تعاون دیتی ہے تاکہ یہ ادارے عربی اور فارسی زبانوں کی تدریس کو باآسانی آگے بڑھا سکیں۔ ان زبانوں کی تعلیم و تدریس کی جدید کاری کے لیے بھی مناسب قدم اٹھائے گئے تاکہ ان اداروں میں اس کے لیے ایک پائیدار بنیاد مہیا کرائی جاسکے۔ پورے ملک میں پھیلے ہوئے مدرسوں کی جدید کاری کے تعلق سے بھی اہم اور دوررس نتائج پر مبنی قدم اٹھایا گیا ہے۔ اس کے تحت پرائمری سے اعلا درجوں کے لیے سماجی علوم، سائنس اور ریاضی کی کتابیں تیار کی گئیں اور اس اسکیم کے تحت آنے والے مدرسوں کو بھیجی بھی گئیں۔ اس انقلابی قدم کی موقر علما حضرات نے سراہنا کی۔ یہاں میں ضرور آپ سب لوگوں سے گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک مدرسوں کو modern education سے نہیں جوڑا جائے گا ان کا modernization نہیں ہوگا، upgradation نہیں ہوگا، تب تک ایک بہت بڑا طبقہ موجودہ زندگی کی بہت سی جو نئی نئی چیزیں ہیں ان سے محروم رہے گا۔ وہ آگے بڑھنے کے ناقابل ہوجائے گا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ آپ جو دینی تعلیم دینا چاہتے ہیں وہ بخوشی دیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو موجودہ علم ہے، جو موجودہ سائنس ہے جس کے ذریعے لوگ ترقی کر رہے ہیں دنیا کے لوگ، اس کی طرف بھی پوری توجہ دی جائے۔ اور اس کو بڑھانے کی پوری کوشش کی جائے۔ جتنی جلدی یہ کام ہم کر پائیں گے اتنی جلدی جو عام لوگوں کے من میں ایک اندر سے یہ خیال ہے کہ مسلمان پچھڑا ہوا ہے، وہ آگے کچھ نہیں کرسکتا، یہ بھاونا کم ہوگی اور لوگ سامنے آئیں گے۔ میں آپ سے یہ بار بار کہتا ہوں کہ میں یہ مانتا ہوں اور پوری طاقت کے ساتھ مانتا ہوں، اپنی پوری آستھا اور وشواس کے ساتھ مانتا ہوں کہ مسلمان ہندستان میں minority نہیں ہیں۔ آپ اسی طرح سے اکثریت ہیں جیسے کہ میں ہوں، جب تک یہ فضا بنی رہے

گی کہ مسلمان minority ہیں تب تک اور مذہبی minority ہیں، تب تک بہت سی چیزیں جنھیں ہم جلدی سے جلدی سلجھانا چاہتے ہیں، وہ الجھی پڑی رہیں گی۔ آپ اسی خاندان کے ہیں، آپ اسی ملک کے ہیں۔ genetically جو آج سائنس کی بھاشا میں کہوں تو ہمارے آپ کے جینس سب کے ایک ہیں۔ ایک ہی خاندان ہے، یہ بات ختم ہونی چاہیے۔ میں ایران گیا تھا تو وہاں بھی ہم نے ان سے کہا تھا کہ ہم اور آپ ایک ہی فیملی کے ہیں۔ آپ اپنے ملک کو ایران کہتے ہیں جو آرین ہی کا دوسرا روپ ہے۔ آپ کے شاہ کا پہلے آریہ مہر کا خطاب تھا اور انھوں نے کہا کہ ہم آریہ ہیں تو میں نے کہا کہ کیا بات ہے۔ ہم بھی آریہ ہیں، آپ بھی آریہ ہیں۔ We belong to Aryan family تو یہاں سب کے سب بیٹھے ہیں We belong to Aryan family اور اس میں minority اور majority کا سوال کہاں ہے؟

اور میں نے ان سے کہا کہ جناب خاتمی صاحب آپ کا نام نہ بتایا جائے اور ہندستان میں اسی اپنی ویش بھوشا میں جائیں تو لوگ کہیں گے کوئی صوفی درویش گھوم رہا ہے۔ اور میں اپنا یہ تلک ہٹا کے اور پاجامہ کرتا پہن کر آجاؤں تو مجھے کہیں گے کوئی ایرانی آدمی ایران میں گھوم رہا ہے۔ ہماری facial similarity اتنی ہے racial similarity اتنی ہے۔ تب میں نے کہا کہ ہماری آپ کی ایک special relationship ہونی چاہیے۔ racial, facial, special خاتمی صاحب اس کو جگہ جگہ بولتے ہیں کہ صاحب انھوں نے یہ بات کہی۔ ہمارے درمیان ہر چیز یکساں ہے، ایک ہے۔ مذہب الگ ہو سکتے ہیں، ہمارے اس ملک میں دنیا کے جتنے مذہب ہیں وہ سب رہیں گے، پنپیں گے، پھولیں پھلیں گے۔ پوری آزادی رہے گی۔ لیکن اس کے باوجود ہم اور آپ ایک خاندان کے ہیں اور یہ بیسک سدھانت ہے تو اس کے مطابق ہم میں سے کوئی نہ minority ہے اور نہ کوئی majority۔ آپ برابر کے حق دار ہیں۔ اسی راستے سے آگے آیئے۔ برابر کی دوڑ میں آگے آیئے۔ ملک آپ کا بھی اتنا ہی ہے جتنا میرا ہے۔ اس بھاؤنا کے ساتھ کام ہونا چاہیے کہ تو میں سمجھتا ہوں کہ بہت جلدی وہ تمام چیزیں یہاں سے ڈھل جائیں گی جو ہمارے دیش کی فضا کے لیے نقصان دہ ہیں، تکلیف دہ ہیں۔ اس لیے یہ پوری آستھا کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ بات جتنی جلدی ختم ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ اس میں آپ صاحبان کی مدد چاہتا ہوں۔ آپ اس نظریے کو دور تک پھیلائیں اور یہ جو تفرقہ ہے، فرق ہے یہ دور ہونا چاہیے۔ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ اردو اور ہندی کے ذریعے ہم اسے جلدی سے جلدی دور کر سکتے ہیں۔ اگر اردو اور ہندی مل جائیں تو پھر ہندو اور مسلمان کو ملنے میں کوئی دقت نہ رہے گی۔ یہ ایک راستہ ہے جس سے ہم نزدیک آسکتے ہیں اور لائے جاسکتے ہیں۔ آنا چاہیے ورنہ میں آپ کو بتا دوں کہ دنیاوی حالات ہیں جو آج، اس میں یہ ملک پچھڑ جائے گا۔ ہمیں بہت آگے جانا ہے۔ داجپئی جی نے کہا 2020 تک اس ملک کو ہم دنیا کے سب سے ترقی یافتہ دیشوں کے ساتھ شمار کرسکیں گے۔ اس حالت میں پہنچنا ہے۔ تو کتنا ٹائم ہے؟ 15,16 سال۔ تو یہ کام ہمیں جلدی جلدی کرنے ہیں اور تیزی کے ساتھ کرنے ہیں اور وہ تبھی سمبھو ہوگا جبکہ اس دیش کی پوری سنکھیا، پورے 100 کروڑ سے ادھک لوگ جو آج ہیں، اسی نظریے سے، یہی وژن لے کر آگے بڑھیں۔ یہ کونسل آگے بھی کام کرتی رہے گی۔ میں وزیر رہوں نہ رہوں، بھٹ صاحب اس کے ڈائرکٹر رہیں نہ رہیں۔ زکریا صاحب پالیٹکس میں رہیں نہ رہیں لیکن زبان تو رہے گی، سنسکرتی تو رہے گی، ہندستان تو رہے گا اور یہ جن سنکھیا بھی رہے گی۔ ایک اور بات یہ بھی آپ سمجھ لیں کہ آج جس طرح کے دنیا میں حالات ہیں انٹرنیشنل، ہمیں ان حالات پر بھی غور کرنا چاہیے۔ سبق لینا چاہیے۔ دنیا میں کس کس قسم کی طاقتیں کس کس طرف، کیا کیا کررہی ہیں اور اگر ہندستان کو ان تمام چیزوں سے بچانا ہے تو ہمیں کس راستے پر اور کتنی جلدی چلنا چاہیے۔ کونسل کا یہ ہمیشہ مقصد رہے گا کہ سارے ہندستان کو ایک ساتھ ایک ہی رفتار سے ترقی کی طرف لے جایا جائے آپ جو بھی مدد، جو بھی امداد کونسل سے چاہیں گے وہ برابر آپ کو ملتی رہے گی۔ آج کونسل اس پوزیشن میں پہنچ گئی ہے کہ میں رہوں نہ رہوں، کوئی رہے نہ رہے لیکن جس راستے پر یہ چل رہی ہے، جو پیغام دے رہی ہے، اس سے اب واپس نہیں ہٹے گی، اب کوئی طاقت اسے پیچھے دھکیل نہیں سکتی۔ تو اس مقام پر ہم پہنچ گئے ہیں اور اس سب میں مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ جو آج تک ہمیں پوری طرح ملتا رہا ہے اور امید ہے آئندہ بھی اسی جوش و خروش سے ہم سب مل کر کام کریں گے۔ کونسل کو نیا مارگ درشن ملے گا۔ اور بہتر سے بہتر اپنی ذمے داریاں ہم سب مل کر نبھائیں گے۔ شکریہ!

□□□

ثروت اقبال

ہندستان میں اردو۔ ماضی، حال اور مستقبل

آزادی سے پہلے غیر منقسم ہندستان میں اردو ہی سب سے زیادہ جاندار زبان تھی، اسے دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ اردو نہ صرف عام بول چال کی زبان تھی بلکہ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں بھی اس کا رواج عام تھا۔ بازاروں اور اسٹیشنوں پر اردو کے بورڈ نظر آتے تھے۔ آزادی کی جدوجہد میں اردو زبان نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن جب ملک آزاد ہوا اور آزادی ملک کی تقسیم کی صورت میں حاصل ہوئی تو ہندستان میں اردو کو ہی سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ اردو زبان جو دہلی اور لکھنؤ میں پلی بڑھی تھی وہیں وہ بے وطن ہوگئی۔ اردو کے دیگر مراکز حیدرآباد اور بھوپال وغیرہ میں اس کا رواج اس طرح نہیں رہا، جیسا کہ آزادی سے پہلے تھا۔

آزادیِ ہند کے بعد پچاس، ساٹھ اور ستر کی دہائیاں اردو زبان پر بڑی سخت گزری ہیں۔ اس دوران اردو کا رواج ختم ہوجانے کی وجہ سے اردو بولنے والوں کی پوری دو تین نسلیں ایسی گزری ہیں جو اردو سے بالکل نابلد ہیں۔ اردو کی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اس زبان کا قیمتی سرمایہ جو اٹھارویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے نصف تک جمع ہوا تھا، بڑی حد تک ضائع ہوگیا۔

ہندستان کی مقبول ترین زبان ہونے کے باوجود اسے مسلم اقلیت کی زبان قرار دینے کی کوشش کی گئی، حالانکہ وہ اقلیت بھی تعداد میں دنیا کے کئی ملکوں کی آبادی سے زیادہ ہے۔ آزادی سے پہلے مسلمانوں کی طرح ہندو اشرافیہ نے بھی اردو کی ترویج و ترقی کے لیے کافی کام کیا تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد ہندی اور اردو براہِ راست ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہوگئیں۔ ہندی جو اکثریت کی زبان تھی، اسے سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی اور اردو کو نہ صرف یہ کہ سرکاری سرپرستی نہیں ملی بلکہ سرکاری حوصلہ شکنی کا بھی سامنا کرنا پڑا اور خود اقلیت کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ اپنے طور پر اردو کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکتی۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو اردو اور ہندی دونوں ایک قبیل کی زبانیں ہیں اور دونوں کی ترویج شانہ بشانہ ہوسکتی تھی۔ لیکن نہ تو اکثریت نے اردو کے معاملے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی اقلیت کو بدلتے ہوئے سیاسی پس منظر کا صحیح ادراک ہوسکا۔ ماضی کی متصادم سوچ کا نقصان سب سے زیادہ مسلم اقلیت اور اردو زبان کو پہنچا۔ وہ سوچ ابھی پورے طور پر تبدیل تو نہیں ہوئی ہے لیکن اب ہندستان میں یہ رجحان پیدا ہورہا ہے کہ اردو زبان کا احیا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں بعض صوبائی سرکاروں نے عملی قدم بھی اٹھایا ہے اور وہاں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔

اردو کو سب سے زیادہ نقصان اترپردیش میں پہنچا جہاں سہ لسانی فارمولے کی ایسی تشریح کی گئی جس میں اردو کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ اترپردیش اور بہار کا لسانی پس منظر ایک سا ہے، بہار میں تو اردو کو اماں مل گئی مگر اترپردیش میں اسے بے دخل کردیا گیا۔

اترپردیش اردو، ہندی دونوں زبانوں کا گہوارہ ہے مگر آزادی کے بعد جتنی بھی حکومتیں اس ریاست میں برسرِ اقتدار آئیں، ان سب نے اردو سے مخاصمت کا رویہ اختیار کیا ہے۔

قیامِ پاکستان کے نتیجے میں ہندستان کی مسلم اقلیت بلاوجہ مجرم ضمیری کا شکار ہوئی اور اس کا رویہ معذرت خواہانہ رہا۔ ملک کی تقسیم سیاسی قوتوں کے ردِعمل اور شخصیات کے ٹکراؤ کے نتیجے میں ہوئی اور ہندستان کے مسلمانوں نے اسے ایک مذہبی تحریک سمجھ کر ہندستان میں اپنی وفاداری کو مشکوک کرلیا۔

مسلم اقلیت میں احساسِ محرومی کچھ اتنا زیادہ تھا کہ انھوں نے بغیر کسی مقابلے یا جدوجہد کے اپنی شکست تسلیم کرلی اور اردو زبان اور ثقافت کو بچانے کے لیے کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کیا۔ ان کے لیے یہی بہت کافی تھا کہ ایک مشاعرہ کرلیا جائے یا فلموں میں دو چار غزلیں شامل کرلی جائیں۔ یہ نہیں سوچا گیا کہ مشاعروں اور فلمی غزلوں کا سلسلہ بھی آگے اسی وقت چل سکتا ہے جب نئی نسلوں کو اردو زبان پڑھائی جائے اور یہ تعلیم کسی باقاعدہ نظام کے تحت ہو۔ مسلمانوں نے ہندستان میں اپنے مذہبی اور تعلیمی اداروں کا کسی حد تک تحفظ کیا ہے لیکن اردو کے معاملے میں لاتعلقی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ ہندستان میں اگر اردو باقی رہی ہے تو وہ مدارس کی مرہونِ منت ہے لیکن مدارس مذہبی تعلیمی ادارے ہیں، وہ سیکولر تعلیم تو دور کی بات ہے اردو ادب اور شاعری کی تعلیم کو بھی ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔

اردو کے زوال اور خصوصاً اترپردیش میں اردو کے عدمِ استعمال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو پڑھ کر روزگار کے مواقع تو میسر نہیں آتے ہیں، لہٰذا اس کے پڑھنے کا کیا فائدہ ہے۔ اردو کے بجائے دوسرے مضامین پڑھے جائیں تاکہ اچھی نوکری مل سکے۔ اس سلسلے میں ماہنامہ ''اردو دنیا'' دہلی نے اپنے اداریے بعنوان ''ہماری بات'' اکتوبر 2003 کے شمارے میں بڑی اچھی بات لکھی ہے۔ موقر جریدہ اپنے اداریے میں لکھتا ہے۔ ''اردو زبان کی تعلیم اور بقا کے لیے بھی ایک انقلابی فکر اور

حکمتِ عملی درکار ہے۔ اردو بولنے والوں کو اپنی زبان کے بارے میں رویہ بدلنا ہوگا جب تک ان کا رویہ نہیں بدلے گا، ان کی فکر گھسے پٹے مفروضوں سے آزاد نہ ہوگی، وہ اس کے فروغ کے لیے کوئی موثر لائحہ عمل تیار نہیں کرسکتے ہیں اور نہ ہی جمہوری نظام کے ایک طاقتور پریشر گروپ کے روپ میں کام کرسکتے ہیں۔ مثلاً اردو بولنے والوں کا عام مطالبہ یہ رہا ہے کہ اس زبان کو روزگار سے جوڑا جائے۔ اس کے جواب میں اگر اسکول ٹیچر اور مترجم کے طور پر چند لوگوں کو نوکریاں مل بھی جائیں تو کیا واقعی اردو زبان کا فروغ ہوگا؟ زبان اور روزگار کو لازم وملزوم فرض کرکے ہم اردو والے یہ بھی دلیل دیتے رہے ہیں کہ چونکہ یہ زبان روزگار کے مواقع سے وابستہ نہیں ہے اس لیے خود اردو والے ہی اسے چھوڑتے جارہے ہیں۔ یہ بڑی حیران کن دلیل ہے۔

ہندستان میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں اور ان کے بولنے والے اپنی مادری زبان کو صرف اس لیے پڑھنا نہیں چھوڑ دیتے کہ وہ منفعت بخش نہیں ہے۔ کوئی بنگالی، پنجابی، تامل، کنڑ اور اڑیا بولنے والا روزگار کی ضرورت کے لیے خصوصاً انگریزی سیکھتا تو ضرور ہے، بولتا بھی ہے لیکن اپنی تہذیبی میراث، اپنی مادری زبان سے دست بردار نہیں ہوجاتا ہے۔ دلی جیسے شہر میں جہاں نفسی نفسی کا عالم ہے، بہت سے لسانی گروپوں کی پوری پوری کالونیاں اور محلے آباد ہیں اور کئی کئی نسلیں گزر جانے کے باوجود وہ اپنے تعلیمی ادارے قائم کرتے ہیں۔ ان کے بچے اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ اسے لکھنا پڑھنا بھی سیکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف اپنے اسی گہوارے میں اردو، جس کسمپرسی کے عالم میں سسک رہی ہے، وہ صورتِ حال کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔''

اسی طرح ایک اور موقعے پر ''اردو دنیا'' نے اپنے اداریے میں لکھا ہے:

''دراصل روزگار سے جوڑنے کی دلیل اس ذہنیت کی پیداوار ہے جو اردو زبان کو ابھی تک یا تو شاہی اور جاگیرداری دور کے درباریوں اور امرا اور رؤسا کی ڈیوڑھیوں سے وابستہ دیکھنا چاہتی ہے یا وہ لوگ ہیں جو اسے آزاد ہندستان میں ہندی کی مسابقت میں وہ اسٹیٹس دلوانا چاہتے ہیں جو شمالی ہند کی بہت سی ریاستوں نے ہندی کو دیا ہے۔ یعنی سرکاری کام کاج کی زبان کا۔ ظاہر ہے کہ جو زبان سرکاری کام کاج کی زبان ہوگی اس میں روزگار کے بہتر مواقع ہوں گے لیکن اس کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں ہے کہ میری زبان اگر سرکاری کام کاج کی زبان نہیں ہے تو میں اسے چھوڑ دوں، ہزاروں سال کی بے وطنی کے باوجود یہودیوں نے اپنی تہذیبی اور لسانی میراث کو بچائے رکھا، اپنی شناخت کو قائم رکھا ہے۔ کیا ہم اردو والے ان سے کچھ سیکھ سکتے ہیں اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ دوسری اقوام کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ ہر بات سیکھنے کے لیے خود تجربہ کرنا تو ضروری نہیں ہے۔''

اردو کے تابناک ماضی بعید اور ماضی قریب کے دو تین مایوس کن عشروں کے بعد اب مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی نئی کرن دکھائی دے رہی ہے۔ مختلف سرکاری اور غیر سرکاری خود اختیار ادارے اور افراد اپنے اپنے دائروں میں اردو کے احیا، رواج اور ترقی کے لیے کوشش کررہے ہیں۔ اس سلسلے میں سید شہاب الدین اور ڈاکٹر اطہر فاروقی نے بھی بہت کچھ لکھا ہے جو اردو کے احیا کا ایجنڈا ہوسکتا ہے۔ ان دو مشاہیر نے اردو ادب کے بجائے اردو تعلیم اور نصاب پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اردو ادب، مشاعرے، فلم اور ٹیلی ویژن کے پروگرام اردو کی بقا کے لیے ضروری ہیں۔ ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے مگر اردو کی بقا اور احیا کے لیے نئی نسلوں کو اردو پڑھانا ضروری ہے۔ وہ صرف باقاعدہ تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

59 Haselregge Road,
Clapham Common, London SW4 7EN

□□□

اردو زبان کی تدریس

معین الدین

اردو کیسے پڑھی اور پڑھائی جائے
درس وتدریس کے جدید سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں تدریسی طریقۂ کار کا تعین
طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید-**پانچواں ایڈیشن**

صفحات: 148 ، قیمت: 29.00

ہندوستان کا شاندار ماضی

مصنف: اے ایل باشم
مترجم: سید غلام سمنانی

ہندوستان کے قدیم تہذیب وتمدن کا مفصل اور مکمل تعارف مستند تاریخی شواہد کی روشنی میں

دوسرا ایڈیشن

صفحات: 748، قیمت: 145.00

اتر پردیش کے لوک گیت

اطہر علی فاروقی

ہمارے لوک گیتوں میں ہندوستان کی عوامی زندگی کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اطہر علی فاروقی نے اتر پردیش کے وہ تمام گیت یکجا کردیے ہیں جو مختلف موقعوں پر عوام کے دکھ سکھ کی ترجمانی کرتے ہیں

صفحات: 652، قیمت: 120.00

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

آشیش کمار سین

امریکی درس گاہوں میں اردو اور ہندی

نیو یارک شہر کی کوئی ماہر نفسیات کتنی معروف زندگی گزارتی ہوگی اس کا اندازہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں، لیکن اپنے معروف نظام کار کے باوجود ایستھر لونگارٹ (Esther Loewengart) ہمیشہ ایک کام کے لیے ضرور وقت نکال لیتی ہیں جس کے بارے میں وہ تسلیم کرتی ہیں کہ 'دنیا کی خاطر وہ اسے مس نہیں کرسکتیں۔'

مہینے بھر کے دوران لونگارٹ مین ہاٹن میں واقع بھارتیہ ودیا بھون کی ہندی کلاسوں میں متعدد بار شریک ہوتی ہیں۔ ہندستان کے پانچ اسفار نے انھیں ہندی زبان کا گرویدہ بنادیا ہے۔ نیویارک کی یہ باشندہ جو خود کو اپنے ہندستانی نام کلپنا سے یاد کیے جانے کو زیادہ پسند کرتی ہیں، کہتی ہیں 'اس ملک کے کلچر اور ثقافت کو سمجھنے کے لیے اس کی زبان کا جاننا ضروری ہے۔'

بھارتیہ ودیا بھون کے ڈائرکٹر پی۔ جیارمن کا کہنا ہے کہ ان امریکیوں کی تعداد میں قابلِ ذکر حد تک اضافہ ہوا ہے جو بجا طور پر ہندی زبان کو سیکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس کے متعدد اسباب ہیں: بعض بالی ووڈ کی ہندی فلموں کو سمجھنے کے خواہاں ہوتے ہیں، جب کہ بعض دوسرے ہندستانی ادبیات میں دل چسپی رکھتے ہیں، یا پھر وہ لوگ ہندی زبان سیکھتے ہیں جو اکثر و بیشتر ہندستان کے سفر پر جاتے رہتے ہیں۔

درشن کرشنا جو میری لینڈ میں واقع ہندستانی اسکول کی ڈائرکٹر ہیں، ان کے بہت سارے طالب علم ہندی اس لیے سیکھتے ہیں کیوں کہ ان کے شریک حیات ہندستانی ہیں۔ ہنستے ہوئے وہ مزید کہتی ہیں'' یا وہ کسی ہندستانی کو شریک حیات بنانے کے خواہاں ہوتے ہیں۔'' ان کے مطابق بہت سارے امریکی ہندستانی فلموں اور شاہ رخ خاں کو پسند کرتے ہیں۔ درشن کرشنا کے مطابق ان لوگوں کا ہندی سیکھنے کا مقصد بالی ووڈ کی فلموں سے لطف اندوز ہونا ہوتا ہے۔ بعض دوسرے امریکیوں کو مذہب، روحانیت اور یوگا بھی ہندستانی زبانیں سیکھنے کی طرف راغب کرتے ہیں۔ میری لینڈ میں راک ولے کی رہنے والی امبر ہاول کو ہندی زبان سیکھنے کی رغبت کولکاتا کے ایک خوانچہ فروش سے ملی۔ وہ کہتی ہیں کہ 'میں یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھوں گی جب تک کہ روانی سے ہندی نہ بولنے لگوں۔'

حال ہی میں ایل (Yale) یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے والے ریان فلونڈ فی الحال ممبئی میں کام کررہے ہیں۔ ہندستان آنے سے قبل فلونڈ نے ہندی سیکھنے کے لیے ہندی کورس میں داخلہ لیا کیوں کہ وہ ہندستان کے کلچر، سیاست اور تہذیب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں۔ ان کے مطابق: 'میں نے انٹرنیٹ پر تلاش کیا اور پایا کہ ہندی بہت بڑے علاقے میں بولی جانے والی زبان ہے، گو کہ مہاراشٹر میں یہ اتنی مقبول نہیں ہے جتنی کہ شمالی ہندستان میں۔'

ہندی ولایات متحدہ کی تیس سے زیادہ یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے، جن میں ہارورڈ، یونیورسٹی آف پنسلوانیا اور یونیورسٹی آف کیلی فورنیا برکلے وغیرہ شامل ہیں۔

ہارورڈ میں اردو۔ ہندی پانچ مرحلہ جات میں طلبہ کو پڑھائی جاتی ہے۔ اردو 101: تعارفی اردو۔ ہندی کورس کے تحت برصغیر کی ملی جلی زبان ہندستانی سکھائی جاتی ہے۔ طلبہ کو فارسی۔ عربی اور دیوناگری دونوں رسم خط سے متعارف کرادیا جاتا ہے۔ پروفیسر علی اسانی جو ہارورڈ یونیورسٹی میں سنسکرت اور ہندستانی مطالعات کے شعبے کے تحت گریجویٹ اسٹڈیز کے ڈائرکٹر اور صدر مدرس ہیں، ان کے مطابق اس نظام کے تحت طلبہ دونوں زبانوں کی ادبی روایات سے واقفیت حاصل کرسکتے ہیں۔

'روایتی طور پر امریکی یونیورسٹیوں میں ایک یا دوسری زبان پڑھائی جاتی ہے۔ ہم اسے مصنوعی تقسیم مانتے ہیں اور ہماری کوشش ہے کہ زبان کے مطالعے کے ایک تکثیری رویے کو فروغ دیں۔ اردو۔ ہندی تعلیم ہندستانی اور پاکستانی طلبہ کے لیے درمیان کی غلط فہمیوں کو دور کرتی ہے۔' ان کے مطابق ہارورڈ یونیورسٹی میں روایتی تعلیمی مواد مشہور و مقبول فلمی گانوں اور معاصر ہندستانی سینما کے اقتباسات سے فراہم کیا جاتا ہے۔

اسانی کے طلبہ میں بہت بڑی تعداد ان امریکیوں کی ہے جو جنوبی ایشیائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے بہتوں نے اس کورس میں داخلہ اس مقصد سے لیا ہے کہ وہ اپنی جڑوں سے وابستہ رہیں۔

کلب الحق فرینکلن کا ہندی زبان سے تعلق ایک جرأت مندانہ اقدام کے طور پر ہوا۔ فرینکلن اور ان کا ایک دوست ہارورڈ یونیورسٹی کورس گائڈ کا سرسری مطالعہ کررہے تھے کہ ان کی نظر اردو۔ ہندی کورس پر پڑی۔ 'میرے دوست نے مجھے اس کورس میں داخلہ لینے کے لیے تاؤ دلادیا۔ گو اس وقت ہم اس پر ہنستے رہے لیکن میں کلاس دیکھنے گیا۔'

میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اس نے مجھے حیران کردیا۔ میں نے وہاں ایک ایسے کلچر کے بارے میں معلومات حاصل کیں جس کے وجود کے بارے میں میں جانتا تک نہیں تھا۔ لاس انجلس کا یہ باشندہ اب ہارورڈ یونیورسٹی میں اردو۔ ہندی

کورس پچھلے دو برس سے پڑھ رہا ہے۔ 'میں اردو کو بولنے کی بہ نسبت زیادہ بہتر انداز میں پڑھ اور لکھ سکتا ہوں،' فرینکلن اعتراف کرتا ہے۔ وہ اردو کو ہندی پر ترجیح دیتا ہے اور اس بارے میں وہ کہتا ہے 'دیوناگری کا ہر لفظ مجھے الجھن میں ڈال دیتا ہے۔'

فرینکلن کے والدین کو نہیں معلوم کہ ان کے بیٹے نے کس مقصد سے اردو کورس میں داخلہ لیا ہے، البتہ وہ فخریہ کہتا ہے کہ 'وہ (والدین) گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران اس کے ساتھ ہندی فلموں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انھوں نے ''لگان'' فلم پسند کی تھی۔'

ہندی اور اردو کی جانکاری نے فرینکلن کے لیے پورے جنوبی ایشیا کا منظر نامہ کھول دیا ہے۔ اس نے جنوب ایشیائی ڈراموں میں کام کرنے کے لیے کوشش بھی کی ہے۔ فرینکلن کو اپنی اردو یا ہندی کی مشق کے لیے یونیورسٹی کیمپس کے ہندستانی اور پاکستانی طلبہ سے رابطہ کرنے میں ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ 'میں ایک افریقی امریکی ہوں، اگر ایک غیر افریقی امریکی میرے پاس آکر افریقی امریکی عامیانہ زبان استعمال کرتا ہے تو میں جذباتی ہو جاتا ہوں، لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ کسی ہندستانی کے پاس جاؤں اور کہوں' کیسے ہو بھائی!'

اسانی جوز ائد از پچیس برس سے ہارورڈ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کے مطابق ان کی کلاسوں میں طلبہ کی تعداد میں قابلِ ذکر حد تک اضافہ ہوا ہے، ان کی پہلی کلاس میں صرف دس طالب علم تھے اور اب انھوں نے طلبہ کی دلچسپی میں اضافے کو محسوس کرتے ہوئے اپنی کلاس کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

'ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ غیر معمولی شوق کے ساتھ اس کورس کی جانب راغب ہو رہے ہیں۔ بعض گریجویٹ طالب علم اس زبان کو اپنے تحقیقی کام کے مدِنظر سیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس ایسے طلبہ بھی ہیں جو ہندستانی کا سفر کرنے کے بعد اس سرزمین کے دامِ سحر میں ایسے گرفتار ہوئے کہ اب وہاں کی زبان سیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس ایسے طلبہ بھی ہیں جن کے جنوب ایشیائی بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ ہیں۔' وہ مذاقاً کہتے ہیں' ہمارا واسطہ بھانت بھانت کے گاہکوں سے ہے۔'

جاسن کروسبی واشنگٹن ڈی سی کی امریکن یونیورسٹی میں قانون اور بین الاقوامی امور کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے تین برس قبل اس وقت ہندی پڑھنی شروع کی تھی جب وہ ہندستانی شہر پونے میں کنسلٹنٹ (مشیر) کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ 'میرے لیے ہندی کا سیکھنا ضروری نہیں تھا لیکن اس زبان نے ہندستان میں میرے لیے زندگی آسان بنا دی۔' وہ کہتے ہیں' میں پورے اعتماد کے ساتھ ہندستانی رکشہ ڈرائیوروں اور دکان داروں سے بات کر سکتا ہوں۔'

شروع میں لوگوں کو کروسبی کے ہندی بولنے پر تعجب ہوتا تھا' لیکن ایک بار جب انھیں معلوم ہو جاتا کہ میں ہندی بول سکتا ہوں تو ان کی خواہش ہوتی کہ مجھ سے مسلسل ہندی میں ہی بات کریں۔' کروسبی کہتے ہیں کہ انھوں نے ہندستان کے اپنے بیس ماہ کے قیام کے دوران خوب لطف اٹھایا اور انھیں اب بھی ہندستان لوٹنے کی امید ہے۔

میکی کیومنکس جو کہ واشنگٹن ڈی سی میں Smithsonian Institution کے نائب سکریٹری کے دفتر میں پروگرام اسپیشلسٹ ہیں، گو خود کو ہندی کا مثالی طالب علم باور نہیں کرتیں لیکن زمانۂ طالب علمی میں ان کا بہترین دوست ایک پاکستانی تھا جس کے لیے وہ اردو سیکھنا چاہتی تھیں لیکن ان کے کالج میں چوں کہ اردو نہیں پڑھائی جاتی تھی لہٰذا انھوں نے ہندی سیکھنی شروع کر دی۔ ہندی زبان میں انھوں نے مہارت براؤن یونیورسٹی رھوڈس آئس لینڈ میں حاصل کی۔ کیومنکس ہندی میں اپنی مہارت کا سہرا ایک ہندستانی ریستوراں میں ایک سالہ نوکری کے سر باندھتی ہیں۔ وہ ہنستے ہوئے کہتی ہیں کہ 'اگر کوئی ہندی سیکھنا چاہتا ہے تو وہ کسی ہندستانی ریستوراں میں نوکری کر لے۔'

کیومنکس کالج کی تعلیم سے 1987 میں فارغ ہو چکی تھیں۔ عدم استعمال کی وجہ سے ان کی ہندی کچھ متاثر ہو گئی تھی لہٰذا میری لینڈ کے دوران قیام میں انھوں نے ہندی کلاسز میں داخلہ لے لیا جہاں انھیں یہ خوش گوار تعجب ہوا کہ وہ دوسرے طلبہ کی بہ نسبت کافی آگے تھیں۔ خوش قسمتی سے انھیں یونیورسٹی آف وسکونسن میں اردو بھی سیکھنے کا موقع مل گیا۔ وہاں انھوں نے ایک ماہر خطاط سے اردو رسم خط سیکھا جنھیں وہ اپنی خوش خطی کا کریڈٹ بھی دیتی ہیں۔ 'لیکن میں اردو رسم خط بہتر طور پر پڑھ نہیں سکتی، یہ ایک خوب صورت رسم خط ہے لیکن دیوناگری کے مقابلے زیادہ پیچیدہ ہے۔'

کیومنکس بوسٹن میں اپنے قیام کے دوران ہندی سیکھنے والے پرائیویٹ طالب علموں کی تدریس کے فرائض بھی انجام دے چکی ہیں۔ وہاں ہندستانیوں کا ردِعمل بہت ہی دل چسپ ہوتا تھا' بالخصوص جب وہ مجھے ہندی بولتے سنتے۔ کچھ لوگ پورے طور پر اس حقیقت کو بھلا دیتے ہیں کہ میں ایک امریکی ہوں، میں کہوں گی کہ بہت سارے ہندستانیوں نے کبھی کسی امریکی کو ہندی بولتے نہیں سنا ہوگا تو انھیں تعجب ہوتا ہے کہ میں اتنی اچھی ہندی بول لیتی ہوں۔'

کیتھرائن کلو سے جو پیشے سے اکاؤنٹنٹ ہیں اور جو دن کے اوقات میں گیتھرس برگ میری لینڈ میں ایک سافٹ ویئر ڈیولپمنٹ کمپنی کی کنٹرولر ہوتی ہیں، خود اپنے اعتراف کے مطابق، رات میں بالی ووڈ کی فلموں کی رسیا ہیں۔ وہ جس ہندستانی سے بھی ملیں اسے ان کی اس دلچسپی پر تعجب ہوا۔ وہ کہتی ہیں کہ انھیں ہمیشہ یہ ہچکچاہٹ دامن گیر رہی کہ ہندستانی کلچر میں ان کی دلچسپی کا ردِعمل ہندستانیوں کی جانب سے جانے کیا ہو،' ہندستانی کلچر جو کہ بہت زیادہ مذہبی ہے میں نہیں سمجھتی کہ میں اس کے ساتھ زیادتی کروں گی لیکن یہ خوف ضرور رہا کہ کہیں میں خود کو زبردستی مسلط تو نہیں کر رہی۔'

کلو سے نے تین سال قبل یوگا کی تعلیم دینی شروع کی تھی، ان کے مطابق 'ایک بار جب آپ یوگا سے منسلک ہو جائیں گے تو آپ اپنا انداز نشست و برخاست درست رکھنے کی کوشش کریں گے۔' ہندستانی کلچر کی طرف ان کا حتمی سفر اس وقت شروع ہوا جب ان کے پڑوس میں رہنے والے ویڈیو اسٹور کے ایک کارکن نے انھیں لگان (فلم) دیکھنے کا مشورہ دیا۔ 'میں نے اسے دیکھا..... وہ بہت ہی خوب صورت فلم تھی، میں تو اس میں اٹک کر رہ گئی۔'

ہندی اور اردو کے علاوہ امریکی یونیورسٹیوں میں، اور پرائیویٹ کورسز کے طور پر بھی، سنسکرت بھی پڑھائی جاتی ہے۔ سودامنی دیش مکھ واشنگٹن ڈی سی کی جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں ہندی کی استاد ہیں، وہ بتھیسڈا، میری لینڈ میں اپنے گھر پر سنسکرت پڑھاتی ہیں۔

دیش مکھ کی ایک طالبہ جین، وہ اس کے نام کا آخری حصہ شائع کرانا نہیں چاہتیں، پچھلے سات برسوں سے بھارت ناٹیم کی رقاصہ ہیں، انھوں نے سنسکرت کورس میں اس لیے داخلہ لیا ہے کہ ناچ کے پس پشت اساطیر کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ جین کہتی ہیں 'میں زبانوں میں بھی دل چسپی رکھتی ہوں، نفس مضمون اور رسم خط جتنا غیر واضح اور مبہم ہوتا ہے، میں زیادہ بہتر انداز میں اس چیلنج کو قبول کرتی ہوں۔' جین نے قدیم یونانی زبان بھی سیکھ رکھی ہے۔ ان کے مطابق جو لوگ سنسکرت سیکھنے میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں یا تو وہ ایسا علمی وجوہ سے کرتے ہیں یا پھر میرے جیسے لوگ، صرف وقتی خوشی کے لیے۔ جین ان دنوں دیش مکھ سے رامائن پڑھ رہی ہیں۔ ان کی استانی ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتی ہیں: 'وہ ایک بہت ہی اچھی طالب علم ہے۔'

کیومنکس نے بھی سنسکرت سیکھنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کا یہ تجربہ ناکام رہا۔ اس کے مطابق: 'واقعی یہ زبان بہت مشکل ہے' الفاظ اتنے مشکل ہیں کہ آسانی سے ادا نہیں کیے جا سکتے، اس تجربے سے مجھے صدمہ پہنچا ہے۔'

خواہ بالی ووڈ کی فلموں سے شہ ملی ہو، ہندستانی چیزوں کی دل ربا کشش ہو یا اپنی ہندستانی وراثت سے خود کو دوبارہ جوڑنے کا احساس، یہ حقیقت ہے کہ بہت سے امریکی ہندستانی زبانوں کے کورسز میں داخلے لے رہے ہیں۔ کلپنا کے مطابق ہندی زبان کی اس کی معلومات اور علم نے اس پر متعدد نئی دنیاؤں کے دروازے کھول دیے ہیں۔ 'اب میں ہندی فلمیں سمجھ سکتی ہوں اگلا محاذ ہندی ادب کا ہے۔'

جدا ہوتے وقت اس نے وعدہ کیا کہ آئندہ ہماری گفتگو ضرور ہندی میں ہوگی۔ **(بشکریہ 'اسپین'، نئی دہلی، دسمبر 2004)**

□□□

جراثیم

مصنف: سی.وی. سبرامنین/مترجم: شریف احمد خاں

جراثیم کرۂ ارض پر پائے جانے والے مختلف النوع جانداروں میں بےحد اہم ہیں۔ یہ مفید بھی ہیں اور مضر بھی۔ زندگی اور موت، صحت اور مرض ہر حالت میں جراثیم ہماری زندگی کا اہم جزو ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں جراثیم سے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

صفحات: 129، قیمت-/36 روپے

چٹانیں بولتی ہیں

مصنف: وشنو مترا/مترجم: انوار رضوی

چٹانیں ہماری کائنات کا اہم حصہ ہیں۔ اس کتاب میں زمین کی ابتدا اور ارتقا کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بعض ایسے حقائق بیان کیے گئے ہیں جن کا انکشاف چٹانوں کے ذریعے ہوا ہے۔ طالب علموں کی آسانی کے لیے متعدد خاکے اور تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔

صفحات: 65، قیمت: -/21 روپے

تیز تر اور دور تر (نقل و حمل کی کہانی)

مصنف: میر نجابت علی/مترجم: مہ جبیں اختر

نقل و حمل انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ پیٹ بھرنے سے لے کر مختلف افراد سے ملنے اور دیگر ضروریات کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا انسان کا شوق بھی ہے اور مجبوری بھی۔ زیرِ نظر کتاب میں ذرائع نقل و حمل کے مسلسل ارتقائی سفر سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 82، قیمت: 28 روپے

جنگلات کی کاشت

مصنف: ایس. کوبھاس/مترجم: مسرت جہاں

جنگل ہمارے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی ندیاں، پہاڑ اور دیگر قدرتی اشیا۔ یہ نہ صرف ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں معاون ہیں بلکہ کئی اہم صنعتوں کا دارومدار بھی ان پر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف جنگلی درختوں اور جنگل سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/24 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

55 کا ہوا جمہوریہ

ترقی کی راہ پر گامزن

آج جبکہ ہندستانی عوامی جمہوریہ کے 55 سال پورے ہونے جارہے ہیں، ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے کتنا سفر طے کرلیا ہے۔ زراعت، صنعت، سماجی بہبود، خوراک کی ضمانت، کم زور اور پس ماندہ طبقوں کی دیکھ بھال کے میدانوں میں مثالی اقدامات کیے گئے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں، ہم نے بسیط آسمانوں کی پیمائش کرنے، سمندروں کی گہرائیوں کی چھان بین کرنے اور دنیا بھر میں سافٹ ویئر پاور ہاؤس کے طور پر جانی جانے والی انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں نئی راہیں پیدا کرنے میں کسی بھی رکاوٹ کو حائل نہیں ہونے دیا ہے۔

یہ سب کچھ اس وجہ سے ممکن ہو سکا کہ ہم عوام کی زبردست طاقت کو بروئے کار لانے میں کامیاب رہے۔ ہندستانی جمہوریت ایک حقیقی نمائندہ اور مشارکتی جمہوریت کے طور پر عوامی سطح تک فروغ حاصل کرتی جارہی ہے۔ اس طرح کہ دستور میں شامل انصاف، آزادی، برابری اور بھائی چارے کے ان محترم آدرشوں کی تکمیل کررہی ہے، جو ہماری جمہوریت کی بنیاد ہیں۔

جب تالیوں کی زوردار گڑگڑاہٹ میں ہماری فوجی ٹکڑیاں مارچ پاسٹ کرتی ہیں اور جھانکیاں تنوع اور کثرت کا مظاہرہ کرتی ہیں تو ہمارا دل فخر سے جھوم اٹھتا ہے۔ ہم نے منفی پیش گوئی کرنے والوں کو غلط ثابت کردیا ہے۔ جمہوریت اور ترقی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

یوم جمہوریت کے مبارک موقع پر ہم اپنی جمہوریت کے پاسداروں، یعنی عوام کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

وزارت اطلاعات ونشریات
حکومت ہند

davp 2003/617

نسیم احمد نسیم

نیپال میں اردو زبان کی صورت حال

اردو والوں کی درونِ ملک یا بیرونِ ملک ہجرت کی داستان نئی نہیں ہے۔ 1327 میں محمد بن تغلق نے دکن کا رخ کیا اور دیوگری کے مقام پر دولت آباد بسایا۔ اس شہر کے گردونواح میں اس کے ہمراہ جاکر بسنے والے اردوداں طبقے اور حکومت کے اہل کاروں نے اردو کو خاطر خواہ فروغ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ علاقہ اردو کا ایک اہم مرکز بن گیا۔۔ اٹھارھویں صدی میں یہ زبان یورپی ممالک میں پہنچی اور جرمنی، برطانیہ اور فرانس کی یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم ہوئے اور درس و تدریس کا باضابطہ سلسلہ شروع ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد اردو کو اور بھی وسیع میدان ملا۔ ایک طرح سے اس زبان کا Westernization ہوا۔ اردو آبادی بحرالکاہل سے بحر اٹلانٹک تک پھیل گئی۔ خلیجی ممالک، برطانیہ، امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا اور کناڈا وغیرہ میں اردو کی نئی بستیاں آباد ہوئیں۔ تقسیم سے قبل صرف ہندستان کے بڑے شہروں سے ہی اردو کے رسائل، جرائد اور اخبارات شائع ہوتے تھے۔ لیکن آج حالات بالکل مختلف ہیں۔ فی الوقت ہندوپاک کو چھوڑ کر دنیا کے تقریباً چالیس ملکوں سے اردو رسائل و جرائد اور کتب شائع ہو رہی ہیں۔

اردو کی درج بالا بستیوں میں ایک اہم بستی نیپال بھی ہے، جسے اکثر نظرانداز کیا گیا ہے۔ یورپی اور خلیجی ممالک جن کا بہت چرچا رہتا ہے، ان جگہوں پر زیادہ تر ایسے شعرا و ادبا آباد ہیں جو کسی ملازمت یا کاروبار کے سلسلے میں وہاں گئے اور پھر وہیں بس گئے۔ وہ آسودگی کے ماحول میں ادب تخلیق کرتے رہے اور ہندوپاک کے رسائل میں اپنی موجودگی درج کراتے رہے۔ ادبی انجمنیں قائم ہوئیں، مشاعرے شروع ہوئے، رسائل جاری ہوئے، ریڈیو اور ٹی وی پر اردو پروگرام کا نشریہ شروع ہوا۔ ہندوپاک اور دیگر ممالک سے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کو مدعو کر کے تارکینِ وطن نے اردو کی بزم سجائی، لیکن اردو زبان کو کیسے ترقی اور استحکام ملے اور کس طرح اپنے تہذیبی سرمایے کو نوجوانوں تک پہنچایا جائے، اس پر کسی نے غور نہیں کیا۔

لیکن یہ امر باعث اطمینان ہے کہ نیپال میں صورت حال مختلف ہے۔ یہ ایک غریب اور پسماندہ ملک ہے۔ یہاں اونچے عہدے اور روشن مستقبل کی گنجائش بہت کم ہے۔ یہی سبب ہے کہ ادھر کا ارادہ شاید ہی کوئی کرتا ہے۔ یہاں اردو کے نام پر جو کچھ موجود ہے، وہ مکمل طور سے اسی ملک کا ہے۔ یہاں تارکینِ وطن اردو کا کام نہیں کرتے، بلکہ اہلِ وطن اردو کی ترویج و ترقی میں مصروف ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو اردو تعلیم دلواتے ہیں۔ ہندستان اور دوسرے ممالک کی طرح وہ اس بحث میں نہیں پڑتے کہ اردو میں اس کا مستقبل ہے کہ نہیں؟ وہ اردو اس لیے پڑھتے ہیں کہ انھیں اس زبان سے قلبی لگاؤ ہے اور یہ انھیں مختلف علوم وفنون کے ساتھ مذہبی اور دینی کتابوں تک بھی پہنچاتی ہے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ آج نیپالی مسلم گھرانوں میں اردو کی تعلیم پر صد درجہ سنجیدگی کے ساتھ دھیان دیا جاتا ہے۔

نیپال صرف پانچ سو میل طویل اور اسّی میل عریض علاقے میں پھیلا قدرتی حسن سے مزین ایک اہم خطۂ ارض ہے۔ یہاں 35 سے زیادہ چھوٹی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں گرونگ، نیواری، تمنگ، برجی، تھتی، اودھی، ہندی، بھوجپوری اور اردو خاص ہیں۔ قومی زبان نیپالی ہے۔ یہاں اردو کی ابتدا اور ارتقا کا شاندار پس منظر رہا ہے۔ نیپالی زبان میں اردو کے خاصے الفاظ مستعمل ہیں۔ نیپال کے شاہی گھرانوں میں فارسی بطور تہذیبی علامت کے رائج رہی ہے۔ کئی شاہانِ نیپال سرکاری و غیر سرکاری کاغذات و مسودات پر اردو میں دستخط کیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ پرتاپ بہادر نے اپنے عہد کے سکوں پر اردو الفاظ کندہ کرائے تھے۔ موجودہ نیپال میں بھی اردو کا چلن عام ہے۔ سرکاری اور عوامی سطح پر تحریر و تقریر اور اشتہارات و اعلانات میں اردو خوب استعمال ہوتی ہے۔ سہیل احمد صدیقی کے مطابق ''نیپال میں مسلم آبادی کا تناسب دو سے تین فی صد تک ہے۔ 1987 کے اعداد و شمار کے مطابق تقریباً سات لاکھ مسلمان ترائی کے علاقے یعنی نیپال گنج، روحٹ، براٹ نگر وغیرہ میں آباد ہیں۔ چونکہ یہ علاقے ہندستان کی سرحد سے ملتے ہیں، لہٰذا یہاں اردو کا زیادہ رواج ہے۔''

یہ اعداد و شمار کافی پرانے ہیں۔ آج نیپال میں مسلم آبادی کا تناسب بھی بڑھا ہے اور اردو کا علاقہ بھی پھیلا ہے۔ اب ترائی کے علاوہ پہاڑی مقامات پر بھی اردو والے آسانی سے مل جاتے ہیں۔۔ یہاں اکثر اسکولوں میں اردو بطور اختیاری مضمون کے موجود ہے۔ جبکہ مدارس میں اس کی تعلیم لازمی ہے۔ 1985 میں یہاں تربھون یونیورسٹی، کاٹھمنڈو میں شعبۂ اردو قائم ہوا۔ یہ کسی غیر ملکی جامعہ میں قائم ہونے والا پہلا باقاعدہ شعبۂ اردو ہے جہاں انٹر کے طلبہ کے لیے اردو اختیاری مضمون کے طور پر داخلِ نصاب ہے۔

1857 میں بیگم حضرت محل کی ہجرت کے ساتھ جو اردو نیپال میں آئی، وہ آج بھی زندگی کے مختلف شعبوں میں پھل پھول رہی ہے۔ یہاں ''انجمنِ اردو نیپالی زبان و ادب''، ''انجمن ارتقائے ادب'' اور ادارہ ''گلزارِ ادب'' نے

اردو کی مقبولیت اور تشہیر میں اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ نیپال کے پرانے شعراء میں نصر اللہ حریف، خواجہ نعیم بدخشی، غلام محمد خانقاہی، برجیس قدر، صاحب زادہ موصوف، منشی محمد حسین، منشی بہادر سنگھ احقر، بھولا ناتھ فلک، امیر الدین واثق، حکیم خواجہ حسن شاہ، فاروق احمد عارف اور خواجہ معظم شاہ نیازی وغیرہ نے اور نئے شعرا و ادبا میں عبداللطیف شوق نیپالی، غلام جیلانی راہی، اشفاق رسول ہاشمی سرور، امیر اللہ اسعدی، محمد عمر اثر، خواجہ علی شاہ قیصر، شوکت علی شوکت، اسماعیل انصاری، زاہد آزاد، نثار نیپالی، عبدالعظیم فہد، شبانہ نکہت، اور مظاہر الحق منظر وغیرہ نے نیپال میں اردو کی ترویج و ترقی میں اہم رول ادا کیا۔ اردو کے فروغ میں یہاں کے مدرسوں، مکتبوں اور درسگاہوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ نیپال کے وہ ضلعے جہاں باضابطہ اردو تعلیم کا نظم و نسق ہے اور بڑی تعداد میں بچے اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ان میں پرسا، روتہٹ، جھاپا، مورانگ، سن ساری، سدھارتھ نگر، سپتاری، دھنوسا، مہوتری، کپل وستو، بانکے اور روپندہی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دھن کوٹا، چتون، للت پور، کاسکی، مکوان پور، نواکوٹ کووری، تن ہن اور براٹ نگر جیسے اضلاع میں بھی ایسے مدرسوں کی اچھی خاصی تعداد ہے جہاں اردو ابتدائی سے ثانوی درجات تک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ مدرسوں کے علاوہ وہ انگلش میڈیم اسکول جو مسلم علاقوں یا ان کے قرب و جوار میں چلتے ہیں وہاں بھی اردو درس و تدریس کا مناسب انتظام ہے۔

صرف شہر بیرگنج میں نصف درجن سے زائد اسکولوں میں اردو تعلیم دی جاتی ہے۔ جن میں ایم ای ایس پبلک اسکول، پربھات تارا اسکول، مدر لینڈ اسکول، گرین لینڈ اسکول، ودیاساگر اسکول اور اقرا پبلک اسکول قابل ذکر ہیں۔ ان اسکولوں میں اردو کی تدریس کے لیے منظور شدہ کتابوں کی ترتیب سے لے کر طباعت تک سارے مرحلے یہیں پر طے ہوئے ہیں۔ یہاں کے مسلمان اردو کو رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور ان کی اردو علاقائی زبانوں سے متاثر ہوتی ہے۔ اس زبان پر عربی، فارسی کے ساتھ سنسکرت اور نیپالی کے بھی اثرات ہیں۔ لیکن اصوات اور املا کو رومن یا دیوناگری حروف میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس لیے علاقائی زبانوں کے اثرات کے پیش نظر اردو کے ہم صوت حروف کی ادائیگی صرف خصوصی توجہ اور مشق سے ہی درست کی جا سکتی ہے۔ اس لیے اساتذہ اس بات کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے ہیں—— یہاں مدرسوں اور اسکولوں میں عام طور سے جو کتابیں زبان سکھانے کے لیے نصاب میں داخل ہیں، وہ سہل اور سلیس زبان میں تیار کی گئی ہیں۔ یہ کتابیں باتصویر اور دیدہ زیب بھی ہیں۔

1- ہمالہ اردو قاعدہ۔ ڈسکوری پبلی کیشن، نیپال
2- ہماری کتاب
3- گلشن اردو 4۔ چمن اسلام

(یہ کتابیں درجۂ اول سے درجۂ ہشتم تک کے طلبہ و طالبات کے لیے ہیں)

حکومت نیپال نے سرکاری اسکولوں میں اردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے منظوری دی ہے۔ وزارت تعلیم اپنی نیپالی تمہید کے ساتھ ثانوی درجات کے لیے درسی کتابیں شائع کرتی ہے جن میں اکثر بہار ٹیکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن کے پیٹرن کو اپنایا جاتا ہے۔

1- اردو برائے درجہ نہم
2- اردو برائے درجہ دہم کتابیں یہاں کے سرکاری اسکولوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

نیپال سے شائع ہونے والے وہ رسائل اور اخبارات جو اردو کی ترقی اور بقا کے لیے ایک عرصے سے کوشاں ہیں اور اردو عوام کی ذہن سازی کرتے رہے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

1- پیغام (سہ ماہی) مدیر: محمد حسن حبیب، الحرا ایجوکیشنل سوسائٹی، نیپال
2- شاہین (ماہنامہ) مدیر: خالد صدیقی، کاٹھمنڈو (فی الحال بند ہے)
3- نور توحید (ماہنامہ) مدیر: عبداللہ مدنی، کرشنا نگر، کپل وستو، نیپال
4- مدھر سندیش (ماہنامہ) مدیر: محمد طاہ حسین۔ الحرا ایجوکیشنل سوسائٹی
5- نئی صدی (پندرہ روزہ) باغ بازار، کاٹھمنڈو وغیرہ

نیپال میں اردو زبان کے ہمہ جہتی فروغ میں الحرا ایجوکیشنل سوسائٹی، کاٹھمنڈو کی کوششیں بھی بڑی اہم ہیں۔ اس تنظیم نے ملک گیر سطح پر تعلیمی بیداری لانے کی کوشش کی ہے، اس سوسائٹی کے بنیادی مقاصد حسب ذیل ہیں:

1- نیپال میں ایسے اسکول اور مدرسوں کا قیام جہاں قدیم و جدید علوم کی تدریس کا بہتر نظم ہو۔
2- لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے علاحدہ ادارے کا قیام
3- ایک مثالی مرکزی درسگاہ کا قیام
4- ایک مرکزی کتب خانے کا قیام
5- ایک علمی و ادبی رسالے کا اجرا
6- ایک جامع نصاب تعلیم کی ترتیب۔

نیپال ایک غریب اور پس ماندہ ملک ہے جہاں خواندگی کی شرح کافی کم ہے۔ اس کو ترقی کی راہ پر لانے کے لیے اشد ضروری ہے کہ علم کی کرنوں کو نشیب کے سبزہ زاروں سے لے کر سنگلاخ کوہستانوں تک پھیلا دیا جائے، تاکہ یہاں کے شہری اپنی زبان اور تہذیب کے ساتھ ایک تابناک مستقبل کی طرف بڑھ سکیں۔ حصول علم کے تئیں لوگوں میں دلچسپی اور سرگرمی پیدا کرنے کا یہ بڑا کام الحرا نے انجام دیا ہے۔

اس پس منظر میں نیپال میں اردو کا مستقبل روشن نظر آ رہا ہے۔

□□□

Kali Bagh, Bettiah-845438

شفیع شیخ

اردو میں عربی کے خودساختہ الفاظ

ہر زبان میں تصرف کا عمل ہوتا ہے۔ یہ عمل اتنا ہی فطری ہے جتنا کسی زبان کا دوسری زبان کے الفاظ مستعار لینا۔ تصرف کا عمل تلفظ، ہیئت اور معنوں کے لحاظ سے تو ہوتا ہی ہے لیکن جنس اور تعداد بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اردو میں بھی اس طرح کے تصرفات ہوئے ہیں۔ عربی الفاظ کے تعلق سے ہم نے پچھلے ابواب میں تصرف کے اس عمل اور اس کی بوقلمونی کو دیکھا۔

بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ زبانیں کسی بھی زبان سے نئے لفظ لینے کی بجائے اس زبان کے قوانین کو اپنا کر اپنا ہی کوئی لفظ وضع کر لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''لوٹ'' ہندی اردو کا نہایت ہی معروف لفظ ہے جس کے معنی غارت گری اور چھینا جھپٹی کے ہیں۔ انگریزوں نے اس سے اپنی زبان میں ایک فعل (To Loot) بنایا اور اسے وہی معنی دیے جن معنوں میں یہ اپنی زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کو انھوں نے پوری طرح اپنا لیا۔ چنانچہ جب انھیں یہ بات زمانہ ماضی کے اعتبار سے کہنی ہوتی ہے تو وہ Looted استعمال کرتے ہیں۔ یعنی اصل فعل (لوٹ) Loot کے آخر میں انھوں نے زمانہ ماضی کا لاحقہ ed- استعمال کرنا شروع کر دیا۔

انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں شاید اس قسم کا تصرف مستحسن قرار دیا جائے کیوں کہ اس سے اس زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اردو میں ہندی اور فارسی زبان کے لفظوں کو عربی قواعد کے طریقے پر لکھنا اور تبدیل کرنا نہایت ہی قبیح فعل سمجھا جاتا ہے۔

اس سلسلے کی ایک مثال عربی لامِ تعریف (الف لام) کا استعمال ہے۔ یہ صحیح ہے کہ الف لام صرف عربی لفظوں کے ساتھ ہی استعمال کیا جاتا ہے لیکن اردو میں بھی یہ پابندی روا رکھنا زبان کی ترقی پر بڑی روک لگاتا ہے۔ زبان کی پاکیزگی اور صحت کے مؤیدین کے نزدیک اس طرح کا تصرف غلط زبان کو رواج دیتا ہے اور طبائع پر گراں گزرتا ہے۔ قریب عربی اور مرگ فارسی کا لفظ ہے۔ ایک زمانے تک لوگ ''قریب المرگ'' لکھتے اور بولتے رہے اور صحت الفاظ کا خیال رکھنے والے مسلسل اس ترکیب کو غلط قرار دے کر اسے ترک کرنے کا مشورہ دیتے رہے۔ اب بھی قریب المرگ لکھنا معترضین کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ یہی حال اسی طرح کی ایک اور ترکیب فوق البھڑک ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں اس ترکیب کی موجودگی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اسے عوام میں کتنی مقبولیت حاصل رہی ہوگی۔ اس ترکیب کو بھی اہل لغت نے غلط قرار دیا اور اس کے استعمال سے بچنے کی تاکید کی گئی۔

اسی طرح سے فارسی اور ہندی الفاظ میں اضافت کی موجودگی بھی اعتراضات کا باعث بنی ہے۔ یہ اضافت عربی اور فارسی الفاظ کے درمیان تو جائز قرار دی گئی[1] لیکن جب ہندی لفظ کو اضافت کے ساتھ استعمال کیا گیا تو یہ ناجائز اور ممنوع ٹھہرا۔ چنانچہ ''لبِ سڑک، ولدِ کسان اور بنتِ بڑھئی'' نامانوس، نامقبول اور نامناسب ترکیبیں ٹھہریں۔

اس سخت اور کٹر موقف نے اردو زبان کو کیا نقصان پہنچایا اس کا محاسبہ ماہرین لسانیات کا کام ہے۔ اس سخت پہرے اور حفاظت کے باوجود کئی ایسے الفاظ اردو کی سلطنت میں گھس آئے ہیں جن کے پاس پاسداران اردو کی سند نہیں ہے۔ ذیل میں چند ایسے لفظوں سے بحث کی جارہی ہے جو عربی زبان کے قوانین کی روشنی میں غیر عربی لفظوں کی مدد سے بنائے گئے ہیں یا عربی لفظوں میں ایسے اضافے کیے گئے ہیں جو عربی زبان میں نہیں پائے جاتے۔

بخوف طوالت اس طرح کی صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اگر اس موضوع پر مستقل طور پر کام کیا جائے تو مزید مثالوں کا فراہم ہونا مشکل امر نہیں ہے۔

اندازاً

فارسی مصدر انداختن سے مشتق ہے۔ چونکہ یہ لفظ فارسی کا ہے اس لیے عربی طریقے پر زبر کی تنوین لگا کر تابع فعل بنانا غلط ہوگا لیکن اردو میں انداز سے اندازاً بنا کر لکھنے اور بولنے کا چلن عام سا ہے۔ یہ لفظ اتنا عام ہو گیا ہے کہ وقفتاً، وقتاً فوقتاً، معاً کی صف میں شامل ہونے کے بعد غیر عربی نہیں معلوم ہوتا۔

انسیت

یہ لفظ اردو والوں نے عربی لفظ اُنس سے بنایا ہے جس کے معنی پیار محبت، الفت، اور لگاؤ کے ہیں۔ اردو میں انسیت جن معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے دراصل وہ اُنس ہی کے معنی ہیں۔ یہ لفظ عوام کی اختراع ہے۔ شعرا نے اُنس ہی استعمال کیا ہے۔

دو دن کی زندگی تھی کس لطف سے گزرتی
تم مجھ سے اُنس کرتے میں تم کو پیار کرتا
(سحر)

بالراست

قریب المرگ اور فوق البھڑک کی طرح بالراست بھی اردو والوں کی وضع

کی ہوئی ترکیب ہے۔ راست فارسی کا لفظ ہے اور الف لام کی علامت معرفہ صرف عربی کے الفاظ کے لیے ہی مخصوص ہے اس لیے اس لفظ کو بالراست کہنا قواعد اور زبان کے مزاج کے اعتبار سے غلط ہے۔

بغاوت

صاحب فرہنگ نے اسے عربی کا لفظ بتلایا ہے۔[2] لیکن عربی کی تمام جامع لغات اس باب میں خاموش ہیں حتیٰ کہ عربی کی مستند لغت المنجد میں بھی یہ لفظ نہیں ملتا۔ یہ لفظ عربی مادّے بغی سے بنایا گیا ہے جس کے معنی خواہش کرنے والا یا ناانصافی کرنے والا ہے۔ اس کا فاعل باغی عربی لغات میں موجود ہے۔ عربی مادّے میں سرکشی اور سرتابی کے معنی نہیں ملتے۔ ایسے لگتا ہے کہ اردو والوں نے باغی سے اس کا مصدر بغاوت بنالیا ہے حالانکہ عربی زبان میں اس کا مصدر بغی ہی ہے۔

''اسبابِ بغاوت ہند'' سرسید کی مشہور کتاب ہے جو انھوں نے 1857 کے ہنگاموں کے بعد لکھی تھی۔ داغ نے بھی اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔

آنسوؤں نے ڈبو دیا دل کو
فوج نے شاہ سے بغاوت کی

تابع دار (تابعداری)

عربی میں تبع کا اسمِ فاعل تابع ہے جس کے معنی پیروی کرنے والے، فرمانبرداری کرنے والے، کے آتے ہیں۔ جب تابع خود اسمِ فاعل ہے تو اس کے آخر میں فارسی لاحقہ ''دار'' بڑھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ یہ لاحقہ غیرضروری اور معنوں کے اعتبار سے بھی زائد ہے۔

اسی طرح تابع دار سے مصدر تابع داری بنانا بھی اسی غلطی کا ارتکاب کرنے کے مترادف ہوگا جو تابع دار میں سرزد ہوئی ہے۔

تلمذ

یہ لفظ بھی عربی زبان میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اردو میں اس لفظ کا استعمال کب شروع ہوا، یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن صاحب فرہنگ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ایک گمان یہ ہے کہ تلمیذ بمعنی شاگرد سے شاگردی کے لیے عربی مصدر تفعّل کے وزن پر تلمذ بنا لیا گیا ہوگا۔ زانوئے تلمذ تہہ کرنا اردو کی کتابوں میں استادی و شاگردی کے سلسلے میں جابجا ملتا ہے۔ اگر تلمذ کو مصدر بروزن تفعّل سمجھ لیا جائے تو اس کا مادّہ لمذ ہوگا۔ جبکہ تلمیذ کا سریانی مادّہ تلمذ ہے جس کی بنیاد پر تلمذ بنایا گیا ہے۔

تنسیخ

نسخ کے معنی عربی میں زائل کرنا یا باطل کرنا ہیں۔ یہ مادّہ وہ ہے جو ثلاثی مزید فیہ کے بیشتر اوزان قبول نہیں کرتا۔ مصباح اللغات نے اس کے صرف تین فعل درج کیے ہیں جو باب مفاعلۃ افتعال اور استفعال پر لائے جاتے ہیں۔[3]

اس حقیقت میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ نسخ کا مادّہ باب تفعیل کو قبول نہیں کرتا۔ عربی ادب اور زبان میں کہیں تنسیخ اور اس باب سے تعلق رکھنے والے دیگر الفاظ نہیں ملتے۔ یہ اردو والوں کا اپنا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔

تنقید

عربی میں نقد سے باب تفعیل کے وزن پر تنقید نہیں بنایا جاتا۔ جن معنوں میں اردو میں لفظ تنقید استعمال ہوتا ہے عربی میں وہ انتقاد یا نقد ہے۔ زبان کی صحت کا خیال رکھنے والے نقادوں نے ابتداءً انتقاد کا لفظ ہی استعمال کیا ہے لیکن آہستہ آہستہ لفظ تنقید کا چلن اس قدر عام ہوگیا کہ لوگوں نے یہ بھلا دیا کہ جس زبان کے اصولوں پر یہ لفظ بنایا گیا ہے اس میں وہ نہیں پایا جاتا۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ اچھائی اور برائی بیان کرنے کے مصادر عام طور پر باب تفعیل کے وزن پر بنائے جاتے ہیں جن میں تحسین۔ تنقیص۔ تقریظ وغیرہ بہت عام ہیں۔

حرافہ

یہ لفظ آجکل مکار اور بدکار عورت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو کے ابتدائی دور میں اردو غزل کی اپنی روایت کے لحاظ سے حراف مستعمل تھا اور اس کی تانیث وضع نہیں کی گئی تھی کیونکہ فرہنگ آصفیہ میں حراف کے معنی درج ہیں اور حرافہ موجود نہیں۔

گو یہ لفظ عربی اسم مبالغہ کے وزن پر وضع کیا گیا ہے لیکن عربی زبان میں کہیں موجود نہیں ہے۔ اردو میں آتش نے ''حراف'' کا استعمال کیا ہے

دل فریبی کا نہیں کون سا انداز آتا
چھوڑتا جان کو عاشق کی وہ حراف نہیں

عربی میں حرّافہ سے ملتا جلتا ایک لفظ حَرَافہ (''را'' غیر مشدّد) موجود ہے جو معنوں کے اعتبار سے بھی اردو لفظ حرّافہ سے قریب ہے۔ اس حَرافَۃ کے معنی چرپراہٹ کے ہیں۔ ہم اسے مرچ کی سی تیزی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ''بصل حرِّیف'' بہت تیز پیاز کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ غالباً مزاج کی تیزی کی بنیاد پر وضع کیا گیا ہے اور بدلتے بدلتے معنوں کے لحاظ سے مکاری اور بدکاری تک پہنچ گیا۔

حفاظت

عربی میں حفظ اور حفاظ بطور مصدر استعمال ہوتا ہے۔ حفاظت عربی لغات میں کہیں نظر نہیں آتا۔ عربی میں حفاظ انھیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن معنوں میں حفاظت اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کے سلسلے میں یہ گمان گزرتا ہے کہ اردو میں حفاظ سے حفاظت بنالیا گیا ہے۔

حفظانِ صحت

عربی میں فعلان کا وزن ضرور موجود ہے لیکن حفظ کا مادّہ اس وزن پر نہیں

لایا جاتا۔ فعلان کے وزن پر عرفان، نسیان وغیرہ ضرور لائے جاتے ہیں لیکن صحت کی حفاظت کے لیے حفظان صحت عربی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے "حفظ الصحۃ" کی ترکیب استعمال ہوتی ہے۔ فرہنگ آصفیہ نے بھی "حفظ صحت" ہی لکھا ہے[4] لیکن آج کل درسی کتابوں میں انگریزی لفظ HYGIENE کا ترجمہ حفظان صحت ہی کیا جاتا ہے۔[5]

شباہت

عربی کی لغات میں موجود نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اہل ایران نے مشابہت سے ملتا جلتا ایک اور مصدر شباہت کی صورت میں بنالیا ہے اور اردو والوں نے فارسی کے اس تصرف کو من وعن اردو میں بھی قبول کرلیا۔ فارسی لغات میں اس لفظ کو عربی بتایا گیا ہے۔ صاحب فرہنگ نے بھی اس لفظ کو مشابہت کے معنوں میں عربی کا لفظ بتلایا ہے۔ اردو میں اس کا چلن عام ہے۔ مصحفی کہتے ہیں

آنے سے خط اور ہی کچھ رنگ ہوگیا
وہ شکل اس کی اور وہ شباہت کہاں رہی

شکیل

عربی میں شکیل لگام کے لوہے پر ظاہر ہونے والی خون آمیز جھاگ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور خوبصورت وجمیل سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ اردو والوں کا گڑھا ہوا لفظ ہے اور جمیل کے قافیہ اور شکل کے مادے پر مبنی ہونے کی وجہ سے غالباً خوبصورت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔ یہ لفظ ہمیں انھیں معنوں میں ذوق کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔

نور معنی ہے بہر شکل نتیجہ اس کا
اللہ اللہ زہے شکل شہنشاہ شکیل

شوقین

شائق کے معنوں میں اردو والوں کی اختراع ہے لیکن اسے صرف شائق ہی کے معنوں میں استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ اسے چھبیلا، رنگیلا اور رسیا کے معنی بھی دیے گئے ہیں اس لفظ میں عربی شوق کا استعمال تو ضرور کیا گیا ہے لیکن ین[6] کے فارسی لاحقے کا اضافہ خالص اردو تصرف ہے۔

طبابت

عربی میں طب کے معنی علاج کرنے کے ہیں۔ اسی مادے سے اس کا مصدر طب بنتا ہے جس کے معنی جسمانی اور روحانی علاج کرنا ہے۔ اردو والوں نے علاج کرنے والے "طبیب" کی رعایت سے "طبابت" علاج کرنے کے معنوں میں طب کے مترادف کے طور پر استعمال کرنا شروع کردیا ہے۔ فرہنگ آصفیہ نے اس لفظ کو عربی بتلایا ہے۔[7]

عربی میں طبابۃ استعمال ضرور ہوتا ہے۔ لیکن وہ طبۃ کی جمع کے طور پر استعمال ہوتا ہے جس کے معنی زمین، کپڑے یا بادل کا ٹکڑا ہیں۔ اس لفظ کا علاج معالجے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عادی

معتاد کے معنوں میں اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ اردو والوں کی اپنی اختراع ہے۔ غالباً عادت سے اسم فاعل بنایا گیا ہے اور اس سلسلے میں تائے مصدر حذف کرکے یائے نسبتی کا الحاق کرلیا گیا ہے۔

اردو میں شعراء نے گاہے بگاہے استعمال کیا ہے۔

تیغ ابرو کی زباں عادی ہوئی
بات سیدھی بھی جو کی ٹیڑھی ہوئی

(وزیر)

علالت

اردو میں بمعنی بیماری استعمال ہوتا ہے۔[8] یہ غالباً عربی علت سے بنایا گیا ہے۔ علت عربی میں بجائے خود بیماری کے معنوں میں مستعمل ہے۔ یہ اردو والوں کا گڑھا ہوا لفظ ہے اور عربی میں اس کا وجود نہیں۔ البتہ عُلَالَۃ ایک لفظ ضرور ہے جو بہلاوے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور بیماری سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

علمیت

علم سے اردو والوں نے بنالیا ہے اور علم ہونا کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ عربی میں اس لفظ کا وجود نہیں ہے البتہ عالمیت ضرور ہے جو عالم سے بنایا گیا ہے۔ اردو میں علمیت سے علمیت بگھارنا بھی استعمال کیا جاتا ہے جس کے معنی شیخی میں آکر عالمانہ بحث کرنا ہیں۔[9]

فحاشی

اس معنوں میں عربی کا صحیح مصدر فحش ہے لیکن اردو میں فحش کو بطور صفت استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے فحش باتیں۔ فحش کتابیں وغیرہ۔ عربی میں فحش مصدر ہے اور صفت فاحش۔ طوائف کے معنوں میں جو لفظ فاحشہ اردو میں استعمال کیا جاتا ہے وہ عربی میں بھی انھیں معنوں میں مستعمل ہے۔ اہل اردو نے فحاشی مصدر بنالیا اور "فحاشی کا اڈا" جیسی ترکیبیں بن گئیں۔ یہ اختراع زیادہ قدیم نہیں معلوم ہوتی کیونکہ فرہنگ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔

قبائلی

اردو میں قبیلے سے تعلق رکھنے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اردو ہی کی اختراع ہے۔ عربی میں قبیلے سے تعلق رکھنے والے شخص کو قبلی کہتے ہیں۔

قبائل، قبیلہ کی جمع ہے۔ قبائلی کا مفہوم کھینچ تان کر کئی قبیلوں سے تعلق رکھنے والا ہوسکتا ہے جو معنوی اعتبار سے نامناسب ہے۔

قبولیت

یہ مصدر بھی گڑھا ہوا ہے اور عربی میں استعمال نہیں ہوتا۔ قبول سے بنالیا گیا ہے اور اس کے معنی اجابت دُعا کے مقرر کیے ہیں۔ ان معنوں کے علاوہ اقرار نامہ، عہد نامہ کے معنوں میں بھی استعمال کیاجاتا ہے۔[10] ''شرفِ قبولیت'' اردو کی خاصی جانی پہچانی ترکیب ہے جو روزمرّہ کی تحریروں میں استعمال ہوتی ہے۔

قریشی

قبیلہ قریش سے تعلق رکھنے والے شخص کے لیے یائے نسبتی لگا کر اردو والوں نے بنالیا ہے۔ اس لفظ کے بنانے میں جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ غلط نہیں ہے لیکن عربی میں قریشی نہیں بولتے۔ ''قبیلۂ قریش'' سے تعلق رکھنے والے شخص کے لیے عربی میں قُرَشی بضمہء اول وبفتحہ ثانی ہے۔

کتبہ

کتبہ بفتحہ اول و بسکون ثانی اردو میں اس عبارت کے لیے استعمال ہوتا ہے جو مسجدوں اور محلوں کے دروازوں پر پتھر پر کندہ کرا کے نصب کرتے ہیں۔ اس کو مقبروں کے سرہانے کے پتھر پر کندہ کی ہوئی عبارت کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

تسلیم کا شعر ہے

دی جان جس نے اس لب لعلیں کے عشق میں
خونِ جگر سے قبر پہ کتبہ لکھا گیا

عربی میں اس لفظ کا وجود نہیں ہے۔ ان معنوں میں عربی میں لفظ کتابہ استعمال ہوتا ہے۔ امیر مینائی نے کتبہ استعمال نہ کرتے ہوئے ان معنوں میں لفظ کتابہ استعمال کیا ہے۔

ملایا خاک میں ان کو جہاں کی بے وفائی نے
کتابہ خطِ کوفی میں لکھو گورِ غریباں کا

مرطوب

رطوبت ناک کے معنوں میں عربی میں استعمال نہیں ہوتا۔ عربی میں مفعول کے وزن پر رطب کا مادہ لانے کا دستور نہیں ہے۔ مرطوب کی جگہ عربی میں رَطب (بمعنی تر) کہتے ہیں اور رطب و یابس تر اور خشک کے معنوں میں اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِی کِتٰبٍ مُّبِیْن

(سورۃ الانعام آیت 59)

ترجمہ: خشک وتر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔[11]

ناسخ نے بھی رطب و یابس کی ترکیب انھیں معنوں میں استعمال کی ہے۔

لکھتا ہوں حال اپنا سب اس کو رطب و یابس
ہونٹوں پہ یاں ہے خشکی آنکھوں میں تری ہے

مرغن

عوام میں یہ لفظ بے حد مرغوب ہے اور فارسی روغن سے بنالیا گیا ہے۔ اس سے ایسا طعام مراد ہے جس میں تیل بہت زیادہ ڈالا گیا ہو۔ اسی طرح بہت زیادہ چربی والے گوشت کو مچرّب بھی کہا جاتا ہے۔ جو چیز لبالب بھری ہو اس کے لیے ملبّب بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ ساری ترکیبیں من گھڑت ہیں کیونکہ فارسی اور ہندی لفظوں کو عربی قاعدوں کی مدد سے فاعل ومفعول نہیں بنایا جاسکتا۔

مزیّب

مرغّن کی طرح مزیّب بھی اردو کا اپنا مخترع لفظ ہے۔ یہ لفظ باب تفعیل پر مفعول بنالیا گیا ہے اور اس کا مادّہ زیب تصور کیا گیا ہے۔ زیب فارسی کا لفظ ہے اور اسے عربی قاعدے پر لا کر مزیّب بنایا گیا ہے۔

زین مادّہ سے ایک لفظ مزیّن اردو میں موجود ہے۔ مزیّب کے بنانے میں مزیّن سے بھی تحریک ملی ہوگی۔ کیونکہ زین اور زیب میں صرف ایک حرف کا فرق ہے۔ یہ لفظ صرف عوام تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ آتش نے بھی اسے استعمال کیا ہے۔

کلفت ایّام سے پروا نہیں کچھ حسن کو
خوبرویوں کو مزیّب ململی پوشاک ہے

مکین

مکین کے معنی اردو میں مکاندار، مکان میں رہنے والا بتائے گئے ہیں۔[12] حالانکہ اس کا مکان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مکان کا مادّہ کان ہے جس میں میم کا سابقہ لگا کر اسمِ ظرف بنایا گیا ہے۔ مکین کا مادّہ مکن ہے اور اس مادّہ سے اسے بروزن فعیل بنایا گیا ہے جس کے معنی عربی میں طاقتور اور مضبوط کے ہوتے ہیں۔ ''المنجد'' نے مکان، مکن کے ذیل میں ضرور دیا ہے لیکن اس کی تصریح بھی کردی ہے۔

''[المکان] الموضع (وھو مفعل من الکون)''[13]

مکین کے معنی ''المنجد'' نے ''ذوالمکانۃ'' دیے ہیں۔ مکانۃ عربی میں قوت، منزلت اور اثر رسوخ کے معنی دیتا ہے۔ اس لحاظ سے مکین کے معنی طاقتور اور اعلیٰ حیثیت والا کے ہوئے۔ عربی لفظ امکان بھی اسی مادّے سے بنایا گیا ہے۔ مکین اردو میں مکان میں رہنے والے کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے۔ غالب کہتے ہیں

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

منادی

مُنادی بضمہ ء اول ڈھنڈورچی کے لیے عربی کا لفظ ہے۔ اردو میں اسے ان معنوں میں استعمال تو کیا گیا لیکن ساتھ ہی ڈھنڈورا کے کیے کوئی عربی لفظ بآسانی ہاتھ نہ آنے کی وجہ سے منادی میں میم کے پیش کو زبر میں تبدیل کر کے مَنادی بنادیا گیا اور اس لفظ سے ڈھنڈورے کے معنی لیے گئے

وہاں کیونکہ روئیے کہ منادی جہاں ہو یہ
زانو کو سر پہ دھر کے نہ بیٹھا کرے کوئی
(رفاقت)

ہلاکت

عربی میں تباہی، موت اور بربادی کے معنوں میں لفظ ہلاک ہی استعمال ہوتا ہے۔ فعال کے وزن پر بنائے گئے مصادر میں بیان کلام، اور سلام جیسے لفظ شامل ہیں اور ہلاک کا شمار بھی انھیں میں ہوتا ہے۔ اہلِ اردو تائے مصدر کے اضافے کے ساتھ بجائے ہلاک کے ہلاکت استعمال کرتے ہیں۔

یکسانیت

یکساں (یک + ساں) فارسی ہے جس کے معنی ایک جیسا اور برابر ہیں۔ اردو والوں نے اس فارسی ترکیب کے آخر میں ''ی'' اور تائے مصدر کا اضافہ کر کے یکسانیت استعمال کرنا شروع کردیا اور اس کے معنی ''ایک جیسا ہونا'' کے لیے گئے۔

حواشی:

(1) جیسے موسم گل، عندلیب چمن وغیرہ
(2) فرہنگ آصفیہ صفحہ 398 جلد اول
(3) صفحہ 870-71
(4) بعد تشخیص دوا کیجیے مرض کی بالضد
حفظ صحت کے لیے نسخہ ہو بالمثل رقم (سودا)
(5) مولوی عبدالحق نے اپنی انگریزی اردو لغت میں (HYGIENE) کا ترجمہ حفظان صحت ہی کیا ہے۔ (صفحہ 566)
(6) اس لاحقہ کی مثالیں ہمیں رنگین، نمکین، آتشین وغیرہ میں ملتی ہیں۔
(7) جلد سوم صفحہ 239
(8) فرہنگ آصفیہ جلد سوم صفحہ 279
(9) فرہنگ آصفیہ جلد سوم 372
(10) تفہیم القرآن جلد اول صفحہ 546
(11) فرہنگ آصفیہ جلد چہارم صفحہ 394
(12) المنجد صفحہ 831
(13) فرہنگ آصفیہ جلد چہارم صفحہ 412

(''عربی زبان وادب کا اردو پر اثر'' سے ماخوذ)

سائنس کی کہانیاں (حصہ اوّل)

مصنف: بسکف اور سکف / مترجم: ڈاکٹر انیس الدین ملک

سائنس ہماری زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اس کے بغیر موجودہ زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ زیر نظر کتاب میں کہانیوں کی مدد سے مختلف اشیا کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے اور ان سے متعلق تمام جانکاری بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 152، قیمت: 18 روپے

عرب کی لوک کہانیاں: ایک تہذیبی ورثہ

مصنف: ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی

کسی بھی ملک اور معاشرے میں لوک ادب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم براہ راست اس ملک اور معاشرے کی تہذیب وثقافت، رہن سہن، خورد ونوش، عادات، اطوار اور عقائد وتوہمات سے واقف ہوتے ہیں۔ لوک ادب ادبی تصنع، فنی قیود اور پابندیوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس لیے یہ عوام سے نزدیک ہوتا ہے۔ اس کتاب میں 28 لوک کہانیاں شامل ہیں جو عوامی لوک ادب کے ہر رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں۔

صفحات: 131، قیمت: -/23 روپے

نورتن کہانیاں

مصنف: محمد بخش مجبور / انتخاب: شمیم احمد

محمد بخش مجبور کی کتاب ''نورتن'' قدیم ادب میں اہم مقام کی حامل ہے۔ نو ابواب پر مشتمل اس کتاب میں دلچسپ انداز میں سبق آموز کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ زیر نظر انتخاب میں بچوں کی ذہنی صلاحیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کہانیوں کی زبان سہل اور عام فہم بنادی گئی ہے تاکہ بچے انھیں بخوبی پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہوسکیں۔

صفحات: 192، قیمت: -/20 روپے

ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز

داستانیں ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف تفریح طبع کا ذریعہ ہیں وہیں ان سے متعلقہ عہد کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مافوق الفطری عناصر کی پیش کش سے قطع نظر داستانوں میں ہماری سماجی وثقافتی تاریخ پوشیدہ ہے۔ اس کتاب میں ایسی ہی تین داستانیں شامل ہیں۔

صفحات: 148، قیمت -/18 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

क़ौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

M/O HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India, West Block-1, R.K. Puram, N.Delhi-66

فنکشنل عربی میں قومی اردو کونسل کا دو سالہ فاصلاتی ڈپلوما

(اللغة العربية الوظيفية)

رجسٹریشن 30 اپریل 2004 تک

اہلیت: عربی کی ابتدائی تعلیم مع قواعد۔ اس کے علاوہ عربی لکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت بھی لازمی ہے۔ عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔

- روزمرہ استعمال ہونے والی عربی زبان اور عربی پڑھنے والے طالب علموں کو معاصر تقاضوں سے جوڑنے کی ایک بڑی کوشش
- باوقار روزگار کے موقعوں سے جوڑنے کے لیے اس کورس کو عربی شارٹ ہینڈ اور کمپیوٹر پیکیج سے جوڑنے کی کوشش

یہ کورس دو سال کی آٹھ اکائیوں (Modules) میں منقسم ہے۔ ہر سال کے لیے چار اکائیاں (Modules) (دو کتابوں کی شکل میں) ہیں جن میں بتیس اسباق عربی مکالمے (Dialogues) پر مشتمل ہیں۔ ہر اکائی میں تدریبات ہیں۔ ہر دو اکائیوں کے لیے گائڈ بک بھی ہے جو عربی مکالمے پر مشتمل اسباق کی اکائیوں سے علاحدہ کتاب کی شکل میں ہے۔ ہر سال چار اکائیاں (Modules) یعنی دو کتابیں مع دو گائڈ بک اور متعلقہ اکائیوں کے اسباق و تدریبات پر مبنی دو اختبارات کونسل کی طرف سے ارسال کی جائیں گی۔ طالب علم ہر پانچ ماہ کے بعد اختبارات کونسل کے اسٹڈی سینٹر میں جمع کریں گے۔ اختبارات کی بنیاد پر کامیاب طالب علم کو دوسرے سال کی چار اکائیاں یعنی دو کتابیں مع دو گائڈ بک اور دو اختبارات ارسال کی جائیں گی۔ دو سال کے اختتام پر ایک پرچے پر مشتمل فائنل امتحان کونسل کے منظور شدہ اسٹڈی سینٹر میں کونسل کی طرف سے لیا جائے گا۔ مجموعی کامیابی کے بعد ہی کونسل کی طرف سے کامیاب طالب علم کو "Diploma in Functional Arabic" کا سرٹیفکیٹ دیا جائے گا۔

فیس: طالب علم فارم اور رجسٹریشن کے لیے -/150 روپیہ یا اس کا ڈرافٹ کونسل کے مندرجہ ذیل کسی بھی اسٹڈی سینٹر میں جمع کر سکتے ہیں۔ اسٹڈی سینٹر کے انچارج مجموعی ڈرافٹ Director, NCPUL, New Delhi کے نام رجسٹرڈ پوسٹ سے قومی اردو کونسل، نئی دہلی کو رجسٹریشن فارم کے لیے ارسال کریں۔ رجسٹریشن کے بعد کتابیں اسٹڈی سینٹر کو ارسال کی جائیں گی۔

کنٹیکٹ کلاس:۔ کونسل کے اسٹڈی سینٹر میں ہر ہفتہ تین کلاسیں عربی بول چال میں مہارت کی غرض سے ہوں گی جس میں طالب علم کی حاضری لازمی ہے۔

کونسل کے اسٹڈی سینٹر کے نام و پتے:۔

1. **A.P. - South Region Branch (NCPUL)**, SYJ Complex, Third Floor, Pathar Gatti, Hyderabad; 2. **Society for Arabic Academy**, 10-3-280, Flat No. 505, Osman Plaza, Humayun Nagar, Hyderabad - 500028 (A.P.), Ph. 23536940; 3. **Hanafia Arabic Institute**, H. No. 17-4-300, Mata Ki Khidki, Outside Dabirpura, Hyderabad - 23, A.P.; 4. **Mahad Uloomil - Hadees**, 2 - 81, Wadi Hadees, Jal Pally, Hyderabad - 500005, A.P., Ph. 040 - 4441717; 5. **Jamiat-ul-Banaath Hyderabad**, 16-2-874/A/2, Jeevan-Yar-Jung Colony, Sayeedabad, Hyderabad, A.P., Ph. 24550191, 24553534; 6. **Jamia Makarim-Ul-Akhlaq** (Centre of Distance Education) Moral Edn & Welf. Society, Quadri Bagh, Amberpet, Hyderabad-13, A.P., Ph. 27403392; 7. **Jaysha Education Society** (Regd), Plot - 88, Road - 3, West Marredpally, Secunderabad - 500026, A.P.; 8. **Assam - Institute of Oriental Studies**, C/o. Samad Ali Bhavan (Opp. to Mirza Galib Road) Sijubari - Dargah Road, P.O - Hatigaon Charıalı, Guwahati - 781038 (Assam), Ph. 0361 - 2224867, 9. **Bihar - Kainat Foundation**, Jehanabad, Bihar - 804418, Ph. 6114 - 255314; 10. **Madarsa Islamia Jame-ul- Uloom** Under aegis of Anjuman Taraqqi

Urdu Hind (Mzf. Branch) Chandwara, Muzaffarpur, Bihar, Ph. 0621 - 2212715, **11. Imarat-e-Sharia Educational & Welfare Trust**, Phulwari Sharif, Patna-801505, Bihar, **12. Delhi - Madarsa Ibrahimia Jamiatul Quran**, Masjid Khalilullah, Batla House, Jamia Nagar, Okhla-25 Mobile : 9811916009; **13. Madarsa Talimul Quran**, Haji Langa, Sector - 3, R.K. Puram, New Delhi, Ph. 11-26178298; **14. Madarsa Zinatul Quraan**, Welcome, Seelampur, Shahdara, Delhi - 53, Ph. 011 - 22828596, 22825578; **15. Gujarat - Jamia Mazher-e-Saadat**, At & P.O. - Hansol, Distt. - Bharuch, Gujrat - 393030; **16.J & K - Fast Track Solution**, 3 - Khidmat Complex, The Bund, Regal Complex, Srinagar-190001, J & K; **17.Kerala - Maunathul Islam Arabic College**, Puduponnani, Ponnuni South (P.O.) Malapuram, Kerala, Pin : 679586, Ph. 666308; **18. Jamia Sa-Adiya Arabiya Sa-adabad**, Deli, P.O. - Kalanad, Kasaragod - 671317, Kerala, Ph. 04394 - 437216, 438216, 437841; **19. M.P. - Shikshodaya M. School Neemuch**, 13/68, Moolchand Marg, Neemuch - 458441 (M.P.), Ph. 07423 - 20427; **20. Mahrashtra - Jamia Islamia Ishaatul uloom**, A/P Akkalkuwa - 425415, Distt. Nandurbar, Maharashtra, Ph. 02567 - 252256; **21. Jamea Rahmania Tahfizul Quran** Salafi, Gali 3, Gandhi Nagar, Char Kop, Kandivli (West), Mumbai - 400067 Ph. 022 - 28056158, 28082004; **22.Jamia Talimul Banat**, Human Development Education & Welfare Society, Akbar Plots, Akot File, Akola - 444003, Ph. 0224 - 2427012, **23.Manipur - Hundred Flowers Higher Secondary School** (CBSE), Pangee Road, Imphal East, Manipur, Pin- 795114, Ph. 0385- 2229294; **24. Rajasthan - Madrasa-e-Gabriel**, 144, Deepak Mark, Near Bachha Park, Adarsh Nagar, Jaipur Ph. 0141 - 2616183, 2078006; **25. Jamea Tul Hidaya**, 1617, Khejre Ka Rasta, Near Indira Bazar, Post Box No 2, Jaipur - 302001, Ph. 0141 - 2319935, 2312386, 2323216; **26. U.P. - Madarsa Ahle-Sunnat Ziyaul-Uloom**, Iltafganj, Ambedkar Nagar - 224 145. U.P., Ph. 05273 - 284527; **27. Darul Uloom Baharshah**, 505, Kandhari Bazar, Faizabad - 224001, Ph. 05278 - 25093, **28. Darul Uloom Ahle Sunnat Madrasa Asharfia Misbahul Uloom**, Mubarakpur, Azamgarh, U.P., Pin : 276404, Ph. 05462 - 250092, 250148, 250149; **29. Jamia Ahsanul Banat**, Near Gokul Das College, Tawela Street, Moradabad - 244001, U.P., Ph. 591 - 2470099, **30.Maktaba - e - Heera**, P.O. Box No. 374, Near Nadwa, Taigore Marg, Lucknow - 226007 (U.P.), Mobile : 9415088189; **31. Baba Farid Educational Society**, Jihinda Shaheed, Amroha (U.P.), Ph. 05922 - 250435; **32.Safa Shariat College**, Wadi-e-Safa, Dumariya Ganj, Siddhartha Nagar, U.P. - 272189; **33. Al-Ameen Institute of Information Technology**, Dr. Khan's Clinic, IInd Floor, Main Bulandhshahar Road, Hapur-245101, Ph. 0122 - 2303033; **34. Habib Higher Secondary School**, Hunsapura - Imli Bagh, P.O. - Kopaganj, Mau, Pin - 275305, U.P., Ph. 0547 - 2506744, 2506727; **35. Madarsa Arabia Faizul Uloom** Mohammadabad, Gohna, U.P.; **36. Muslim Kindar Garden School Society**, Shakhayya Pura, Behraich, U.P.; **37. Darul Uloom Makhdumiyan Arabia**, Vill. & P.O. - Wasa Dargah, Distt. - Siddharthnagar, U.P. Ph. 254795; **38. Madarsa Aashiqul Quraan**, Khajoor's Masjid, Kotla Street, Meerut, U.P., **39.Madarsa Arabia Islamia**, 23/25, Bakhshi Bazar, Wasiatul Uloom, Allahabad-211003 Ph. 0532 - 2656183, **40. All India Educational Society**, Sadar Bazar, Pratapgarh, U.P., Ph. 222309; **41. M.E.T. Public School**, Jam-e-Masjid, Sector - 8, NOIDA, U.P., Ph. 120 - 2424238, 32005437.

نوٹ :۔ (I) جس شہر اور قصبہ میں کونسل کا اسٹڈی سینٹر نہیں ہے۔ وہاں کے 3 سال پرانے رجسٹرڈ مدرسے/ غیر سرکاری ادارے جن کے پاس کنٹیکٹ کلاس کے لیے کم از کم 37.5 Sqmt جگہ اور بنیادی انفرا اسٹرکچر موجود ہے، کم از کم 25 طالب علموں کی مجموعی فیس بہ شکل ڈرافٹ کونسل کو ارسال کرسکتے ہیں تاکہ بعد معائنہ اسٹڈی سینٹر قائم کیا جاسکے۔

(II) نئے اسٹڈی سینٹر قائم کرنے کے لیے 3 سال پرانے اُن رجسٹرڈ مدرسوں/ اداروں سے بھی درخواستیں مطلوب ہیں جن کے پاس کنٹیکٹ کلاس کے لیے کم از کم 37.5 sqmt جگہ اور بنیادی انفرا اسٹرکچر موجود ہے۔

تفصیل کے لیے رابطہ قائم کریں :

ایجوکیشن سیل، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ نمبر 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066

فون: 26109746، 26169416 فیکس: 26108159 ای میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in

محمد جمیل

ہوائی جہاز کی اُڑان کے سَو سال — ایک جائزہ

انسان نے جب چڑیوں کو اپنے پَروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھا کہ وہ بہت آسانی سے ہوا میں اُڑتی چلی جاتی ہیں، تو اس کی بھی خواہش ہوئی کہ وہ بھی کسی صورت سے ہوا میں اُڑ سکے۔ انسان کا یہ خواب 17 دسمبر 1903 کو پورا ہوا۔

جاڑے کی ایک صبح کو رائٹ بھائیوں آرویل اور ولبر نے یہ سچ کر دکھایا۔ آرویل نے ہوا میں 36 میٹر کا فاصلہ 12 سیکنڈ میں اڑ کر پورا کیا۔ لوگ اس کمال کو دیکھ کر دنگ رہ گئے اور اُس کے بعد اُن دو بھائیوں نے 59 سیکنڈ میں 256 میٹر کا فاصلہ اڑ کر طے کیا اور اس طور پر ہوائی جہاز کے اڑان کی بنیاد پڑی۔ انسان کو یہ یقین ہوگیا کہ وہ بذریعہ مشین ہوا میں اڑ سکتا ہے۔ اگرچہ انسان کے لیے مشین کے ذریعے بھی اڑنا کافی دشوار طلب ہوگا۔

اٹھارھویں صدی کے آخر میں طیاروں اور ہوائی تیراکیوں کے ذریعے ہوا میں اڑنے کی ابتدا ہوئی۔ بنیادی اصول یہ تھا کہ گرم ہوا میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ چیزوں کو لے کر اوپر اٹھ سکتی ہے۔ اڑنے کا اصول آرکیمڈیز کے اصولوں پر مبنی ہے کہ اڑان اُسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ اڑنے والی چیز اس ہوا کے وزن سے، جو وہ ہٹاتی ہے، ہلکی ہو۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ غباروں کے ذریعے اڑان میں کامیابی کا سہرا پھر دوسرے دو بھائیوں جوزف اور اِسٹین مانٹ گول فیر کے سر ہے۔ ان کی یہ دریافت کرنے کی قوت (وجدان) تھی کہ اگر ایک بڑے کاغذ کے غبارے میں کافی ہوا بھر دی جائے تو وہ ہوا میں تیرے گا۔ چنانچہ ایک شاندار کامیابی اُس وقت حاصل ہوئی جب 1783 میں پلیٹرے ڈی روزیر ہوا میں مانٹ گول فیر غبارہ میں اوپر اڑا۔ بعد میں گیس غباروں نے گرم ہوا غباروں کی جگہ لے لی۔ یوں سمجھیے کہ ایک ایسے تھیلے کی تشکیل دی گئی جس میں آس پاس کی ہوا کے مقابلے میں ہلکی ہوا بھری تھی اور اس کے ساتھ ایک باسکٹ جوڑ دی جاتی تھی جس میں مسافر بیٹھ جاتے تھے۔ ترقی کی رفتار تیز ہوگئی اور 1785 میں ایک فرانسیسی ماہر طبیعیات جیکوئیس چارلس نے ایک غبارہ جس میں ہائیڈروجن بھری ہوئی تھی اور جس کو چارلس نے خود تیار کیا تھا، انگلش چینل کو پار کیا۔

انیسویں صدی میں درحقیقت اڑان کے میدان میں زبردست ترقی ہوئی۔ اس طرح کے انجن اور پروپیلرس وجود میں آئے اور ایسے جہاز بننے لگے جو بھاپ اور بجلی کے ذریعے اڑ سکتے تھے۔ انیسویں صدی کے شروع میں جو جہاز بنایا گیا، وہ درحقیقت جہاز نہیں تھا بلکہ ایک الپسوائیڈل غبارہ تھا جس میں خاصی جگہ تھی اور ایک ایسا طریقہ استعمال میں لایا گیا تھا جو اسے آگے کو کھینچتا تھا، چونکہ یہ آس پاس کی ہوا سے ہلکا تھا اس لیے اڑنے میں کوئی دشواری نہیں تھی اور اس میں مسافر بیٹھ سکتے تھے اور بار برداری کا سامان بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جا سکتا تھا۔

صحیح معنوں میں 1852 میں پہلا ہوائی جہاز بنا جس کو فرانس کے ہنری گی فرڈ نے بنایا، لیکن یہ ہوائی جہاز آج کے ہوائی جہاز سے شکل و شباہت میں بالکل مختلف تھا۔ 1900 میں ایک مضبوط قسم کا ہوائی جہاز تیار کیا گیا جس کو جرمنی کے فرڈلی ننیڈ زیپلن نے مشقت سے بنایا۔ اس ہوائی جہاز کی اندرونی ساخت المونیم کی تھی اور اپنی پہلی فلائٹ پر 5 آدمیوں کو لے گیا لیکن اس کی شکل آج کے ہوائی جہاز سے بالکل مختلف تھی۔ اس کو آپ المونیم کا غبارہ سمجھیے جس میں گیس کے سیلنڈر لگے ہوئے تھے اور دو موٹر جس میں سے ہر ایک 12 کلوواٹ کا تھا، اس کو آگے ڈھکیلتا تھا۔ بعد میں اس میں اور وسعت پیدا کی گئی۔ اب 11 مسافر جا سکتے تھے، اور اس غباری جہاز کی رفتار 35 کلومیٹر فی گھنٹہ تھی۔ 1940 تک اسی غباروی جہاز کا چلن تھا۔ ظاہر ہے یہ ہوائی جہاز عیش پسند اور امیر لوگوں کے لیے تھا۔ جیسے جیسے ٹیکنالوجی میں ترقی ہوئی غباروی ہوائی جہاز کی لمبائی بھی بڑھتی گئی اور 45 میٹر سے بڑھ کر 245 میٹر ہوگئی۔

اب ہوائی جہاز کی خوبصورت تشکیل کے سلسلے میں دوڑ شروع ہوگئی۔ ڈونالڈ ڈوگلاس امریکہ کا پہلا ایروناٹیکل انجینئر تھا جس کو 1908 میں ہوائی جہاز کا شوق پیدا ہوا اور یہ شوق اور زیادہ شدید ہوگیا جب اُس نے ارول رائٹ کو بذریعہ غباروی ہوائی جہاز ورجینیا کے فوجی افسروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے ہوئے دیکھا۔ تو اُسے خیال ہوا کہ ایک ہوائی جہاز کمپنی بنانی چاہیے اور اس نے ڈیوڈ ڈیوس سے مل کر 1920 میں ڈیوڈ ڈوگلاس کمپنی بنائی۔ 1924 میں اس کا نام ڈوگلاس ہوائی جہاز کمپنی رکھا گیا اور حیرت ہے کہ چھ مہینے کے اندر اس کے دو جہازوں نے 43200 کلومیٹر کا سفر دُنیا کے چاروں طرف طے کیا اور جلد ہی یہ دُنیا کی سب سے بڑی ہوائی جہاز کمپنی ہوگئی۔ اس کمپنی کا پہلا ہوائی جہاز سی۔3 تھا جس میں 14 مسافروں کی جگہ تھی جو آرام سے بیٹھ سکتے تھے، لیٹ بھی سکتے تھے اور

کچن باتھ روم وغیرہ سب اُس میں تھے۔

1967 میں کمپنی کے نام میں تھوڑی تبدیلی ہوئی اور اب یہ کمپنی میکڈونلڈ ڈوگلاس ہوگئی۔ اس کی مدِ مقابل رو بوئنگ کمپنی ہے۔ 1915 میں ولیم ای بوئنگ نے پہلا ہوائی جہاز بی ڈبلو بنایا۔ یہ دو آدمیوں کے بیٹھنے کا جہاز لکڑی، تار اور ہلکے باریک کپڑے سے تیار کیا گیا تھا۔ بوئنگ نے ہوائی جہاز کی صنعت میں غیر معمولی ترقی کی اور ایک کمپنی قائم کی جس کا نام پیسفک ایرو پراڈکٹ رکھا۔ بعد میں اس کا نام بدل کر بوئنگ ایروپلین کمپنی کردیا۔ بوئنگ نے ایک تجارتی پلین بی-1 بنایا جس نے 3/مارچ 1919 کو بوئنگ جہاز اور پائلٹ ایڈی ہوبرٹ سیٹل اور وینکور جو متحدہ امریکہ کے مغربی ساحل اور کینیڈا کے مغربی ساحل پر واقع ہیں، ان دونوں شہروں کے درمیان ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا جس کو پہلا بین الاقوامی ہوائی شاہراہ کہا جاسکتا ہے۔ بوئنگ کمپنی نے بہت جلد حیرت انگیز ترقی کی اور انجن پروپیلر بنانا شروع کیا اور پہلی جنگِ عظیم میں بوئنگ ٹرانسپورٹ نے کافی خدمت انجام دی اور دوسری جنگِ عظیم میں بہت بڑے بڑے بم برسانے والے جہاز (Bombers) مثلاً بی-17 اور بی-19 مہیا کیے۔

دوسری جنگِ عظیم میں جیٹ انجن کی ابتدا ہوئی لیکن اس کی بہت زیادہ قیمت ہونے کی وجہ سے اس کی تجارتی اہمیت زیادہ نہیں تھی۔ بہرحال بوئنگ اور اس کا مدِ مقابل ڈوگ لاس دونوں نے اس بات کی کوشش کی کہ جیٹ ہوائی جہاز کی سروس مسافروں کے لیے شروع کی جائے۔ اس میں پہلی کامیابی اُس وقت ہوئی جب اس نے چار انجن والا ہوائی جہاز 707 تیار کیا اور 1935 میں پین ایم امریکن کے حوالے کردیا، لیکن دوسرے ہی سال ڈوگلاس نے یونائیٹڈ سروس کے لیے ڈی سی-5 مسافر جہاز تیار کیا۔ 1960 میں چھوٹے ہوائی جہاز 707 اور ڈیلٹا 727 کی ابتدا ہوئی جس کا مسافر بردار ہوائی جہاز کی حیثیت سے بڑی تعداد میں دنیا کے ملکوں میں استعمال ہوا۔

1970 کی دہائی میں کثیر تعداد میں لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرنے لگے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ چھوٹے جہاز چونکہ ناکافی ہیں، بڑے جہاز ہونے چاہئیں تاکہ وہ ضرورت کو پورا کرسکیں۔ چنانچہ ایسے جیٹ کی ضرورت محسوس ہوئی جس میں مسافروں کی گنجائش کافی ہو اور دنیا کا پہلا جمبو جیٹ 747 وجود میں آیا اور یہ اتنا مشہور ہوا کہ اس کو "ہر آدمی کا جہاز" کا خطاب دیا گیا۔

747 جمبو جیٹ جہاز کی لمبائی 45 میٹر ہوتی ہے، اس میں اکونومی کلاس کی صرف لمبائی رائٹ بھائیوں کے سب سے پہلے جہاز کی لمبائی سے زیادہ ہے۔ فی زمانہ بوئنگ جیٹ سب سے زیادہ استعمال میں ہے جس میں 524 مسافر بیٹھ سکتے ہیں اور جس کی چوڑائی 6 میٹر سے زیادہ ہوتی ہے۔

کیا یہ انسان کا حیرت انگیز کارنامہ نہیں ہے کہ آپ 12 یا 13 ہزار کی اونچائی پر 800 سے 1000 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے نہایت سکون کے ساتھ اڑتے ہوئے اور فلم دیکھتے ہوئے چلے جارہے ہیں۔ ناشتہ اور کھانے کا معقول انتظام اور جب ضرورت ہو، ضروریات سے بھی فارغ ہوسکتے ہیں اور اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ جہاز آسمان میں 17 گھنٹے رہ سکتا ہے کیونکہ تیل کو محفوظ رکھنے کی جگہ پیچھے (یعنی دُم کی ساخت کی طرف) پروں میں اور ایندھن ٹینک میں ہوتی ہے۔

بوئنگ کی حریف کمپنی ڈوگلاس کب پیچھے رہ سکتی تھی۔ ڈوگلاس نے ڈی سی-10 ہوائی جہاز بنایا اور ایک نیا مسافر جیٹ ہوائی جہاز عام لوگوں کے سامنے لایا۔ اس کا نام ایم ڈی-80 رکھا۔ 1990 میں انھوں نے دو مسافر بردار جہاز بنائے۔ پہلے کا نام ڈی-90 رکھا جو ایم ڈی-90 کی بہتر شکل ہے اور اسی کمپنی نے پھر ایم ڈی-11 بنایا جو ڈی سی-10 سے بڑا ہے۔ بہرحال بوئنگ سبقت لے گیا۔ بوئنگ نے 1997 میں میکڈونلڈ ڈوگلاس کو خرید لیا اور بوئنگ اب دُنیا میں سب سے بڑی ہوائی جہاز کمپنی ہوگئی۔

ہوائی جہاز کے تاریخ کی یہ کہانی اس وقت تک مکمل نہیں ہوگی جب تک کہ لاک ہیڈ ہوائی جہاز کا ذکر نہ کردیا جائے۔ لاک ہیڈ ہوائی جہاز کے موجد (عجیب اتفاق ہے) دو بھائی ہیں جن کے نام اَلان اور ملکم لغینڈ ہیں۔ ان دو بھائیوں نے ہوائی جہاز بنانے کی کمپنی قائم کی جس کا نام لغینڈ ایئر کرافٹ مینوفیکچرنگ کمپنی رکھا۔ یہ کمپنی 1916 میں قائم ہوئی۔ اس کمپنی نے اُس وقت ایک جہاز بنایا جو اُس وقت دُنیا کا سب سے بڑا جہاز تھا جس میں 10 آدمی بیٹھ سکتے تھے اور 1918 میں یہ جہاز نہایت کامیابی کے ساتھ اُڑا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہوائی جہاز کمپنی قائم کرنے میں بہت زیادہ سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ لاک ہیڈ ایئر کرافٹ کمپنی 1921 میں بند ہوگئی اور ایک نئی کمپنی قائم ہوئی جس کا نام میلکم لاگ ہیڈ تھا۔ بعد میں اس کا نام لاک ہیڈ بائیڈرالک ۔۔ ایک کمپنی ہوگیا۔

1926 میں اَلن لاگ ہیڈ اور جیک نارتھرپ نے لاک ہیڈ ہوائی جہاز کارپوریشن قائم کیا اور ایک حیرت انگیز کامیاب تیز رفتار ہوائی جہاز تیار کیا جس کا نام ویگا رکھا گیا۔ یہ ہوائی جہاز 16000 کلومیٹر کا سفر طے کرسکتا تھا اور اس کی رفتار تقریباً 300 کلومیٹر فی گھنٹہ تھی اور اس میں 6 آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ ویگا کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ 1929 میں اَلن لاگ ہیڈ نے کمپنی کو ڈیٹرائٹ ہوائی جہاز کارپوریشن کے ہاتھ فروخت کردیا جس نے نئے نئے قسم کے ہوائی جہاز کی ایجاد قائم رکھی۔

آج کے زمانے میں بوئنگ کے تجارتی ہوائی جہازوں کو صرف ایک ہوائی جہاز کمپنی سے سخت مقابلہ ہے۔ وہ یوروپین کنسورشیم ایئر لائن انڈسٹریز ہے جس کا بڑے ہوائی جہازوں کی صنعت میں ایک اہم مقام ہے۔

ایئربس صنعت کی ابتدا 1960 میں ہوئی جبکہ امریکہ کے صنعت کار بوئنگ، ڈوگلاس اور لاک ہیڈ ہوائی جہاز کی صنعت پر چھائے ہوئے تھے۔ کئی یوروپین کمپنیوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ امریکن تجارتی صنعت کاروں سے مقابلہ کرنے کے لیے سب کمپنیاں مل کر ایک چھتری کے نیچے آجائیں اور اس کمپنی کی صدارت اُس کمپنی کے سپرد ہو جس نے 1974 میں سب سے پہلے ہوائی جیٹ اے-300 کا تعارف کرایا یعنی ایئربس انڈسٹریز اور ساری کمپنیاں اس کی زیر قیادت کام کریں۔ اس کمپنی کا صدر دفتر فرانس کے شہر تولوس میں ہو اور جن چار ایئربس کمپنیوں نے تعاون دیا وہ یہ ہیں: فرانس کی ایرواسپٹیل، برطانیہ کی ایرواسپیس، جرمنی کی ڈویش ایرواسپیس اور اسپین کی ایروناٹکس۔

ایک بڑا فرق اے-300 کے ہوائی جہازوں اور بوئنگ کے 707 اور لاک ہیڈ کے ایل-1101 اور ڈوگلاس ڈی سی-10 کے جہازوں میں یہ ہے کہ اے-300 میں دو انجن ہوتے ہیں اور بقیہ کمپنیوں کے ہوائی جہازوں میں 3 انجن ہوتے ہیں۔ ایک انجن کے کم ہونے کی وجہ سے وزن کم ہوجاتا ہے۔ ایندھن کم خرچ ہوتا ہے اور نفع زیادہ ہوتا ہے۔ ایئربس انڈسٹریز سب سے بڑا ہوائی جہاز اے-380 ڈبل ڈیکر جمبوجیٹ بنا رہا ہے جو غالباً 2005 تک ہوائی اڈوں پر آجائے گا۔ یہ ڈبل ڈیکر جمبوجیٹ دنیا کا عجوبہ ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوگا وہ اونچائی پر بیٹھے آسمان کی سیر کر رہے ہوں گے۔ یہ جہاز ایک ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا ہوگا اور ہمیں پتہ بھی نہ چلے گا کہ ہم سفر کر رہے ہیں۔ جہاز میں بیٹھے ہوئے کتاب پڑھ رہے ہوں گے جیسے اپنے گھر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہوں۔

ایئربس ڈبل ڈیکر جو یوروپین انڈسٹریز بنا رہا ہے اور جلد ہی ہوائی اڈوں پہ مسافروں کے لیے آجائے گا، یہ ایئر انڈسٹریز کی زبردست کامیابی ہوگی۔ چنانچہ بوئنگ کمپنی کیوں کر پیچھے رہ سکتی ہے۔ ایئربس ڈبل ڈیکر کے مقابلے میں بوئنگ دو 747 اور 274 بنا رہا ہے۔ ایک 747 ایکس جہاز ہے اور دوسرا 747 اسٹریچ ایکس۔ ایکس ماڈل کے جہاز میں 442 مسافر بیٹھ سکیں گے اور جس کی طاقت سولہ ہزار پانچ سو کلومیٹر اڑنے کی ہوگی اور اسٹریچ ایکس جہاز میں 522 مسافر بیٹھ سکیں گے اور اس کی طاقت 14500 کلومیٹر اڑنے کی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک اڑان میں مسافر 14 سے 16 ہزار کلومیٹر جا سکیں گے۔ بوئنگ کے یہ دونوں قسم کے جہاز 2005 تک ہوائی اڈوں پر آجائیں گے۔

ہوائی جہاز کی اڑان سے متعلق ہندستان اور دنیا کے دوسرے ممالک کا ریکارڈ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لہٰذا پہلے ہم ہندستانی ریکارڈوں کو دیکھیں۔

ہندستان کا سب سے اونچا ہوائی اڈہ کہاں ہے؟

یہ ہوائی اڈہ لیہہ پر ہے جو لداخ میں ہے جس کی اونچائی سطح سمندر سے 3256 میٹر ہے۔

سب سے بڑی تعداد پھنسے ہوئے شہریوں کی

انڈین ایئرلائنز اور ایئر انڈیا نے مل کر 111711 پھنسے ہوئے ہندستانی شہریوں کو عمان (راجدھانی اردن) سے 488 اڑان کے ذریعے 1990 میں منتقل کیا۔ اڑان کی تاریخ میں یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

تاریخ میں پہلی بار صرف عورتوں نے ہوائی جہاز چلایا

کیپٹن سودامنی دیشکھ اور ان کے ساتھ پائلٹ ڈی وے دتا بھانسن اور ایئرہوسٹس نے تاریخ سازی کا کام کیا جبکہ انھوں نے انڈین ایئرلائنز آئی سی 258(737-200 بوئنگ) کی سلچر سے کولکتہ کے لیے 15 جنوری 1986 کو اڑان بھری۔

ہوا میں دو مسافر بردار جہازوں کی ٹکر

12 نومبر 1996 کو شام کے 6 بج کر 41 منٹ پر قزاقستان کے ہوائی جہاز آئی ایل 76 اور سعودی عرب کے ایک بوئنگ جہاز 747 کے درمیان اوپر ہوا میں 14000 فٹ کی اونچائی پر ٹکر ہوگئی اور 350 مسافر مارے گئے۔ یہ ٹکر ہریانہ کے بھیوانی ضلع میں ہوئی۔

دنیا کے مختلف ملکوں سے اب آپ ہوائی جہازوں کی تاریخ ساز پرواز کے سلسلے میں واقعات سنیے:

دنیا کے چاروں طرف سب سے تیز ہوائی پرواز

31 گھنٹے 27 منٹ اور 49 سیکنڈ میں ایئرفرانس نے 16-15 راگست 1995 کو پوری دنیا کا چکر کاٹا۔

پہلا جیٹ جہاز جس کی رفتار فی گھنٹہ آواز کی رفتار سے بھی زیادہ تھی

ایک بال ایکس 1-5 ہوائی جہاز گلیمورس گلینس جس کو متحدہ امریکہ ایئرفورس کے کپتان جس کا نام چارلس ای یوگر تھا، اڑان بھری اور اس کو پہلے ہوائی جہاز کا شرف حاصل ہوا جس کی رفتار 14 راکتوبر 1947 کو آواز کی رفتار سے بھی زیادہ تھی۔

سب سے چھوٹا دو سطحی طیارہ (بائی پلین)

بمبل بی ٹو دو سطحی طیارہ (ایسا طیارہ جس میں صرف دو پر ہوں، ایک دوسرے کے اوپر) جس کو رابرٹ ایچ اسٹار جو متحدہ امریکہ کے ایریزونا کے باشندے تھے، انھوں نے ڈیزائن کیا تھا۔ یہ سب سے چھوٹا دو سطحی طیارہ تھا جو ہوا میں اڑا۔ یہ صرف ایک آدمی کو لے کر اڑ سکتا تھا۔ اس کے پر کی چوڑائی

1.68 میٹر تھی اور لمبائی 2.64 میٹر اور جہاز کا وزن 179.8 کلوگرام تھا اور اس کی رفتار 306 کلومیٹر فی گھنٹہ تھی۔ بدقسمتی سے ایک حادثے میں ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔

سب سے چھوٹا مونوپلین

بے بی برڈ جس کو ڈونالڈ آر اسٹیٹس نے نمونہ بنایا اور تیار کیا، سب سے چھوٹا مونوپلین ہے جو ہوا میں اڑا۔ یہ 3.35 میٹر لمبا اور اس کا پر 1.91 میٹر چوڑا، اور جہاز کا وزن 114.3 کلوگرام اور رفتار 1.77 کلومیٹر فی گھنٹہ تھی۔

دنیا کا سب سے بڑا ہیلی کاپٹر

اس ہیلی کاپٹر کا نام روسی مِل ایم-12 اور رُوٹر کا قطر 67 میٹر تھا اور لمبائی 37 میٹر تھی اور وزن 101.6 ٹن تھا۔ اس میں 14 انجن لگے ہوئے تھے اور یہ 1971 کی پیرس کی ہوائی نمائش میں رکھا گیا۔ اگرچہ اس ہیلی کاپٹر نے کبھی اڑان نہیں بھری۔

دنیا کا سب سے چھوٹا ہیلی کاپٹر

دنیا کا سب سے چھوٹا ہیلی کاپٹر جس میں صرف ایک آدمی بیٹھ سکتا تھا (ڈبلیو ایس-8) بہت ہی ہلکا ہیلی کاپٹر تھا اور 1976 میں ڈنمارک میں بنایا گیا۔ اس میں 35 ہارس پاور کا انجن تھا اور اُس کا وزن 53 کلوگرام تھا اور اس کے رُوٹر کا قطر 4.5 میٹر تھا۔

پہلی بغیر رُکے ہوئے دنیا کے چاروں طرف اڑان

جیمس گلچر نے اپنے بوئنگ بی -50اے جہاز میں جس کا نام لکی لیڈی تھا، 12/مارچ 1949 کو بغیر رُکے ہوئے دنیا کے چاروں طرف کا سفر مکمل کیا۔ اُس نے 37743 کلومیٹر کا فاصلہ 94 گھنٹوں میں طے کیا۔

دنیا کا سب سے تیز ہوائی جہاز

ایس آر - 71 لاک ہیڈ دنیا کا سب سے تیز ہوائی جہاز ہے۔ یہ 30 منٹ تک برطانیہ کے اوپر 3291 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے اڑتا رہا۔

اکیسویں صدی میں اگر ہم جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ ٹیکنالوجی کے زبردست انقلاب نے ہوائی جہاز میں 1935 کے مقابلے میں جبکہ ہوائی جہاز ایجاد ہوا اور آج اُس میں اتنی زبردست تبدیلی ہوئی ہے کہ انسان حیران ہے۔ ہوائی جہاز کی ٹیکنالوجی کی بنیاد پر بالخصوص لڑائیوں میں انقلاب آگیا ہے۔

مثلاً جب برطانیہ نے افغانستان میں دو لڑائیاں لڑیں۔ ایک انیسویں صدی کے وسط 1842-1839 میں اور دوسری تقریباً انیسویں صدی کے آخر 1880-1878 میں۔ اُس وقت ہوائی جہاز کی ٹیکنالوجی معمولی تھی۔ پہلی افغان لڑائی میں برطانیہ کے پندرہ ہزار فوجی ہلاک ہوگئے، لیکن 11/ستمبر 2001 کے بعد جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تو امریکی فوجی جوانوں کی ہلاکت 300 بھی نہیں پہنچی۔ اتنا زبردست فرق اس لیے ہوا کہ ہوائی جہازوں کی اہمیت میں زبردست اضافہ ہوا اور ہوائی جہاز کے ذریعے جو بمباری کی گئی، برقی نظام سے آراستہ تھی۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہوائی جہاز کے استعمال میں ایک انقلاب آگیا۔ سیٹیلائٹ ٹیکنالوجی نے ہوائی جہاز کی اہلیت کو بڑھایا اور اب صورت حال یہ ہے کہ بذریعہ ہوائی جہاز زمین پر کسی نقطے کا تعین بالکل صحیح طور پر کیا جاسکتا ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ انفرا ریڈ سینسرس کا گرمی سے زبردست تعلق ہے۔ چنانچہ اس کی مدد سے ٹرک، ٹینک وغیرہ، حتیٰ کہ ہوائی جہاز بھی جن سے گرم گیس نکلتی ہے، چیزیں اندھیرے میں چل رہی ہوں یا جنگلوں سے گزر رہی ہوں آسانی سے اُن کا تعین ہوجاتا ہے۔

ٹیکنالوجی کے ذریعے نئے نئے جہاز وجود میں آرہے ہیں جن کی رفتار فی گھنٹہ کلومیٹر خاصی بڑھ گئی ہے۔ دوسری طرف لڑائی کے میدان میں زمینی لڑائی کے بجائے ہوائی جہاز کے ذریعے لڑائی ہونے لگی ہے اور سیٹیلائٹ اور انفرا ریڈ سینسرس نے لڑائی فیصلہ کن ہونے میں زبردست مدد کی ہے اور جس ملک کو ٹیکنالوجی میں جتنی سبقت حاصل ہوگی اُتنی ہی اُس کی برتری ہوگی۔

(بشکریہ "سائنس کی دنیا" جولائی۔ستمبر 2003)

''اردو دنیا'' اور ''فکر و تحقیق'' کے سالانہ خریدار بنیں

''اردو دنیا'' اردو کے حال اور مستقبل کا آئینہ ہے۔۔۔خود بھی مطالعہ کریں اور اپنے احباب کو بھی اس کے مطالعے کی ترغیب دیں۔

سالانہ قیمت:100 روپے بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک

ماضی کی علمی بازیافت اور حال کی علمی فتوحات سے واقفیت کے لیے **''فکر و تحقیق''** کا مطالعہ کریں۔

سالانہ قیمت:100 روپے بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک

National Council for Promotion of Urdu Language, New Delhi

کے نام درج ذیل پتے پر روانہ کریں: (دہلی سے باہر کے لوگ -/110 روپے کا چیک بھیجیں)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

ابوبکر عباد

ڈاکٹر الفریڈ اور نوبل انعام

دولت و شہرت اور عزت و مرتبے کے لحاظ سے نوبل ایوارڈ دنیا کا سب سے بڑا انعام ہے۔ ابتداءً یہ پانچ موضوعات فزکس، کیمسٹری، میڈیسن، لٹریچر اور قیام امن میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے اشخاص کو ان کی خدمات کے اعتراف میں دیا جاتا تھا، لیکن 1949 سے اس میں ایک اور موضوع معاشیات کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔ دنیا کے اس سب سے بڑے اور معتبر ایوارڈ کی بنیاد الفریڈ نوبل نے رکھی تھی۔

الفریڈ نوبل 1833 میں سویڈن کی راجدھانی اسٹاک ہوم میں پیدا ہوئے۔ نام کا دوسرا حصہ ان کے آبائی گاؤں نوبلی لو سے منسوب ہے جہاں سے ان کے آباؤ اجداد کا تعلق تھا۔ الفریڈ کے والد پیشے کے اعتبار سے تاجر تھے لیکن انھیں سائنسی ایجادات سے بیحد دلچسپی تھی۔ جب انھیں اپنے یہاں تجارت میں زبردست خسارہ اٹھانا پڑا تو وہ روس چلے گئے، جہاں ان کا کاروبار خاطر خواہ پھلا پھولا۔ وہیں انھوں نے پرائیویٹ ٹیچر رکھ کر الفریڈ کی تعلیم کا انتظام کیا۔ الفریڈ کو کیمسٹری اور زبانوں کے مطالعے کا شوق تھا، جن پر انھوں نے بطور خاص توجہ دی۔ وہ سویڈش کے علاوہ روسی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں سے بخوبی واقف تھے۔ جرمنی، فرانس اور امریکہ کے سفر کے دوران ان کی شخصیت میں نکھار آیا اور فکر میں توازن پیدا ہوا۔ وہ پہلے کے مقابلے اب زیادہ روشن خیال، خود آگاہ، ترقی پسند اور آفاقی ذہن کے مالک بن گئے۔

1863 میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ سویڈن لوٹ آئے اور اسٹاک ہوم میں اپنے والد کی قائم کی ہوئی دھماکہ خیز مادہ تیار کرنے والی لیباریٹری میں کام کرنے لگے۔ اس کام میں ان کے والد کو مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے روس کے لیے خشکی کے ساتھ ساتھ پانی میں دھماکہ کرنے والا ایک نئے قسم کا مادہ بھی تیار کیا تھا، جس کا کریمیا کی جنگ میں کامیاب استعمال کیا گیا۔ اس نوع کے کاموں میں اپنے والد کی معاونت کرنے سے الفریڈ کی دلچسپی سائنسی ایجادات میں بڑھنے لگی، اور انھوں نے تیس سال کی عمر میں 'نوبل اگنائٹر' نام کا ایک دھماکہ خیز مادہ ایجاد کیا جسے دھماکہ خیز مادوں کے تحقیقی میدان میں بیحد اہم تسلیم کیا گیا۔ اس کے چند برسوں بعد انھوں نے ڈائنامائٹ ایجاد کیا جس کی وجہ سے کانوں کی کھدائی اور عمارات اور سڑکوں کی تعمیر کے علاوہ سرنگ بنانے کے کام میں ایک بڑا انقلاب آیا اور یوں جو کام اب تک عام مشینوں اور ہاتھوں کے ذریعے سست روی اور طویل عرصوں میں ہو پاتے تھے، اب انتہائی سرعت کے ساتھ کم وقت میں انجام پانے لگے۔ ویسے تو الفریڈ نے 1866 میں ڈائنامائٹ کا پیٹنٹ کروالیا تھا، لیکن بعد میں انھوں نے اس میں اور بھی کئی تبدیلیاں کیں، اور توپ اور بندوق جیسے ہتھیاروں کے لیے جدید قسم کے دھماکہ خیز مادے تیار کیے۔ ان اشیا کی مانگ اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے انھوں نے جرمنی، اٹلی، فرانس اور اسکاٹ لینڈ وغیرہ میں بھی تجربہ گاہیں قائم کیں جن میں آتش گیر مادوں کے علاوہ ربڑ، چمڑا اور مواصلاتی نظام وغیرہ پر تحقیقی کام ہوتا تھا۔ وہ اپنی تجربہ گاہوں میں ایجاد ہونے والی تمام چیزوں کا نہ صرف پیٹنٹ کروالیتے بلکہ انھیں تیاری کے مرحلے سے گزار کر تجارت کی منزل تک بھی پہنچاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے تین سو پچپن چیزوں کا پیٹنٹ کروایا، اور ان پیٹنٹ شدہ اشیا کے کاروبار کے لیے بیس ملکوں میں تقریباً 90 فیکٹریاں قائم کیں۔ اس اعتبار سے الفریڈ نوبل کو دنیا کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کا بانی کہنا شاید غلط نہ ہو۔ اس عالمی پیمانے پر تجارت سے ان کے پاس بے تحاشہ دولت جمع ہوتی گئی، لیکن وہ سکون نہ مل سکا جس کے وہ متمنی تھے۔ افراد خاندان کے ساتھ خوشگوار لمحات گزارنے کے لطف اور گھریلو مسرت کے حصول سے وہ محروم رہے۔ کاموں کی زیادتی اور مختلف جگہوں پر پھیلے ہونے کی وجہ سے، ان کی زندگی کے بیشتر اوقات سفر میں گزرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ "میں جہاں کام کرتا ہوں وہی میرا گھر ہے، اور میں ہر جگہ کام کرتا ہوں۔" چھ ملکوں میں ان کے ذاتی مکان تھے، لیکن پیرس شہر انھیں سب سے زیادہ پسند تھا، جہاں سے انھوں نے بیس برسوں تک اپنے کاروبار کی نگرانی کی۔

سائنسی ایجادات سے دلچسپی اور کاروبار کے شوق کے علاوہ الفریڈ نوبل شعر و ادب کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے خود بھی کئی زبانوں میں شاعری کی اور مضامین تحریر کیے۔ دوستوں کے نام لکھے ان کے خطوط اپنے بے تکلفانہ اظہار اور طرز بیان کے باعث خاص ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اچھا ادب انسانی قلب و ذہن کو سنوارتا اور ان کی تہذیب و تنقیح کرتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی وصیت میں ادیب کو بھی اسی درجے پر فائز کیا جس پر بنی نوع انسان کے دوسرے خدمتگار متمکن تھے۔ الفریڈ انگریزی کے مشہور شاعر شیلی کی رومانی نظموں کے دلدادہ اور ان کے امن پسند نظریات سے متاثر تھے۔ انھیں اخوت و رواداری کی چاہت اور جنگ و جدال سے سخت نفرت تھی، یہاں تک کہ وہ لوگوں کے آپسی تنازعے کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

بچپن سے ہی الفریڈ کی صحت اچھی نہ تھی، ہمیشہ بیمار اور کمزور رہنے کی وجہ سے وہ بیحد جذباتی اور کسی قدر چڑچڑے ہو گئے تھے۔ ان کی گفتگو پر مزاح ہوتی تھی لیکن اکثر اوقات ان میں گہرا طنز پوشیدہ ہوتا تھا۔ وہ اپنی ماں کو عقیدت کی حد تک چاہتے تھے۔ وہ عمر بھر تنہا رہے اور شادی نہیں کی، تاہم ان کی زندگی میں دو تین خواتین ضرور آئیں۔ ان میں سے ایک آسٹریا کی بیرونس مارتھا فان سٹر تھی، جس سے وہ اسی وجہ سے کافی متاثر تھے کہ بیرونس نے امن تحریک میں اہم کردار نبھایا تھا۔ وہ کچھ عرصے تک الفریڈ نوبل کی پرائیویٹ سکریٹری بھی رہی تھی، جسے بعد میں 1905 کے امن انعام سے نوازا گیا۔ الفریڈ اس سے شادی کرنا چاہتے

تھے لیکن خود بیرونس مارتھا کسی اور کو چاہتی تھی، جس سے اس کی شادی بھی ہوگئی۔
اس کے بعد الفریڈ کی شناسائی ان سے 23 سال چھوٹی ویانا کی ایک خاتون صوفی ہس سے ہوئی۔ یہ تعلق اٹھارہ برسوں تک قائم رہا لیکن بالآخر ناکام ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ صوفی ہس کی ذہانت کی سطح الفریڈ سے کافی کم تھی۔ الفریڈ اسے اپنے مزاج و معیار کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے، لیکن کوششوں کے باوجود دونوں میں ذہنی یکسانیت اور سوچ وفکر میں ہم آہنگی نہ پیدا ہوسکی۔

یہ المیہ ہی ہے کہ پوری دنیا کو اپنا گھر سمجھنے والے اور بنی نوع انسان سے بے حد محبت و ہمدردی رکھنے والے الفریڈ کی پوری زندگی تنہا گزری۔ وہ زندگی کے آخری دنوں تک سرگرم عمل رہا اور آخر کار یورپ کا یہ امیر ترین سیاح اپنا سارا مال و اسباب ایک وصیت نامے کے ذریعے آئندہ نسلوں کو سونپنے کے بعد 10 دسمبر 1896 کو اٹلی کے شہر سان ریمو سے اس جہانِ رنگ و بو کو خدا حافظ کہہ کر، کبھی نہ لوٹنے والے سفر پر روانہ ہوگیا۔

وفات سے چند دنوں قبل انھوں نے اپنا وصیت نامہ اس طرح لکھا تھا:

''میں ڈاکٹر الفریڈ برنارڈ نوبل اپنی تمام جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کے سلسلے میں جن کا نقشہ 27 نومبر 1895 کو تیار کرلیا گیا تھا — یہ وصیت کرتا ہوں کہ انھیں رقم میں تبدیل کرکے محفوظ طریقے سے جمع کروا دی جائے اور اس جمع شدہ رقم سے حاصل ہونے والا منافع ہر سال ان مخصوص افراد کو انعام کی شکل میں تقسیم کردیا جائے جنھوں نے گذشتہ برسوں میں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے بے حد اہم، نئے اور نمایاں کارنامے انجام دیے ہوں۔ منافع کی رقم کے پانچ برابر حصے کیے جائیں اور ان کی تقسیم اس طرح کی جائے: ایک حصہ اس شخص کو دیا جائے جس نے فزکس کے شعبے میں کوئی نئی دریافت کی ہو۔ دوسرا حصہ اس کو دیا جائے جس نے علم بایولوجی یا میڈیکل سائنس میں کوئی نئی ایجاد کی ہو۔ تیسرا حصہ اس شخص کو دیا جائے جس نے کیمسٹری میں کوئی نئی تحقیق کی ہو۔ چوتھا حصہ اس شخص کو دیا جائے جس نے ادب کے میدان میں کوئی مثالی، معیاری، نیا اور اہم فن پارہ تخلیق کیا ہو۔ اور پانچواں حصہ اس شخص کو دیا جائے جس نے دنیا کے کسی بھی ملک میں بھائی چارہ اور امن و آشتی کی جدوجہد اور جنگ مخالف کوششوں میں فعال کردار ادا کیا ہو۔''

الفریڈ نے اپنی وصیت میں امن انعام دیے جانے والے شخص کا انتخاب کرنے کے لیے ناروے کی پارلیمنٹ سے ایک مخصوص کمیٹی تشکیل دینے کی سفارش کی تھی اور بقیہ چار انعامات سے متعلق فیصلے کے لیے انھوں نے سویڈن کے تین اداروں کو نامزد کیا تھا۔

جب ان کے انتقال کے ایک مہینے کے بعد جنوری 1897 میں وصیت نامہ کھولا گیا تو دستورِ زمانہ کے مطابق ان کے وارثوں میں بھی زبردست تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وراثت کے دعویداروں میں صرف افراد و اقوام ہی نہیں، کئی ممالک بھی شامل تھے۔ چونکہ الفریڈ نے کئی ملکوں میں سکونت اختیار کر رکھی تھی اس لیے وہ سب ان کی شہریت کے دعویدار تھے۔ دوسرے یہ کہ وصیت لکھنے میں انھوں نے کسی وکیل سے مدد نہیں لی تھی جس کی وجہ سے وصیت نامے میں کئی قانونی کمیاں راہ پاگئی تھیں۔ تیسرے سویڈن کی پارلیمنٹ اور وہاں کے حکمراں آسکر ثانی نے بھی اس معاملے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ دراصل آسکر ثانی چند سیاسی وجوہ اور اپنے حریف ملک ناروے سے اختلافات کی بنا پر نہیں چاہتے تھے کہ امن انعام کے انتخاب کا حق ناروے کے پاس محفوظ رہے، جس کی وضاحت الفریڈ نے اپنی وصیت میں کردی تھی۔

مختلف ممالک کی رسہ کشی اور خود حکومت سویڈن کی دخل اندازی کی وجہ سے معاملہ پیچیدہ اور مزید کشمکش زدہ ہوتا جارہا تھا۔ لیکن الفریڈ نوبل کے ایک بے حد عقیدت مند اور ان کے مددگار رہے مسٹر ریگنار سومن نے، جنھیں الفریڈ نے وصیت لاگو کروانے کا مجاز بھی قرار دیا تھا، دو سال کی جی توڑ محنت و کوشش اور الفریڈ کے بھتیجے ایمانوئیل کے تعاون سے اس تنازعے کو حل کروانے میں کامیابی حاصل کرلی اور اس طرح الفریڈ نوبل کو سویڈن کا شہری تسلیم کرلیا گیا، آسکر ثانی نے وصیت نامے کی توثیق کردی اور متعلقہ کمیٹیوں نے دستاویز پر دستخط کردیے۔ آئندہ کے کاموں کو بحسن و خوبی انجام دینے اور نظم و نسق سنبھالنے کے لیے نوبل فاؤنڈیشن کی تشکیل عمل میں لائی گئی، اور اس کا باضابطہ ایک دستور العمل تیار کیا گیا جو 29 جون 1900 سے نافذ العمل ہے۔

نوبل فاؤنڈیشن ایک آزاد ادارہ ہے جسے الفریڈ کی جمع شدہ رقم کے استعمال کے حقوق حاصل ہیں۔ یہ فاؤنڈیشن چھ ارکان پر مشتمل ہے جن کی شہریت لازمی طور پر سویڈن اور ناروے کی ہوتی ہے۔ ان میں سے پانچ ممبر ہوتے ہیں جن کا انتخاب انعامات کا فیصلہ کرنے والے ادارے کرتے ہیں، اور ایک صدر ہوتا ہے جس کا تقرر سویڈن کی حکومت کرتی ہے۔ رائل سویڈش اکادمی آف سائنسز کو فزکس اور کیمسٹری، اور کیرولنسکا انسٹی ٹیوٹ کی نوبل اسمبلی کو بایولوجی اور میڈیسن کے شعبوں میں انعامات کے حقدار کو منتخب کرنے کے اختیارات حاصل ہیں۔ سویڈش اکادمی لٹریچر کے فیلڈ میں انعام کے اہل شخص کا انتخاب کرتی ہے، اور نارویجین نوبل کمیٹی جس کے پانچ رکن ناروے کی پارلیمنٹ کے ذریعے نامزد کیے جاتے ہیں، چند ماہرین کی مدد سے امن انعام کے حقدار کا تعین کرتی ہے۔ طریقۂ کار یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام اہم اداروں، انجمنوں، سائنسدانوں اور ادیبوں سے ان کی رائیں طلب کی جاتی ہیں، اور ان رایوں پر ہر سال فروری میں غور کرنا شروع کردیا جاتا ہے۔ بعدازاں یہ کمیٹیاں اپنی اپنی تجاویز وسط اکتوبر تک خفیہ طریقے سے متعلقہ اداروں کو ارسال کردیتی ہیں۔ جن پر آخری اور قطعی فیصلے کی مہر ثبت کرنے کے بعد بتدریج انعامات کا اعلان کیا جاتا ہے اور 10 دسمبر یعنی الفریڈ نوبل کی یوم وفات پر دونوں ملکوں (سویڈن اور ناروے) میں تقریبات منعقد کرکے منتخب افراد کو انعامات سے نوازا جاتا ہے۔

Deptt. of Urdu, Delhi University, Delhi-7

□□□

تحریر: جیتندر ورما
ترجمہ: اے۔ ایم۔ ظفر حسنین

انسانی دماغ کا بہروپ

اپنے ننھے بچے کی توتلی آواز آپ کے لیے ناقابلِ فہم ہے؟ اگلی مرتبہ جب وہ گولڈی لوکس (goldylocks)'' کے بجائے'' ڈوڈی لوٹس (dodilots)'' کہے تو آپ ایک سافٹ ویئر کی مدد سے اُس کی بولی کو سمجھ سکیں گے۔ یہ سافٹ ویئر بولیوں اور آوازوں کے تجزیے پر کام کر رہے'' قومی دماغی تحقیقی مرکز'' (The National Brain Research Centre) میں تیار کیا جا رہا ہے۔ NBRC کی اسپیچ اینڈ لینگویج تجربہ گاہ میں تیار کیا جانے والا سافٹ ویئر مختلف قسم کی حیوانی اور انسانی بولیوں، مختلف قسم کی موسیقی اور اسی طرح کی متعدد آوازوں کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت سے آراستہ ہوگا۔

آئندہ چند ماہ کے اندر متوقع ہے کہ یہ سافٹ ویئر spectral اور temporal دونوں ہی قسم کے زیروبم کے حوالے سے آوازوں کا تجزیہ کرنے کے قابل ہوگا۔ Temporal modulation سے مراد ہے، ایک مخصوص مدت میں آواز کی حدِ ارتعاش (frequency) میں تبدیلی (سست یا تیز) اور Spectral modulation سے مراد ہے آوازوں کی حدِ ارتعاش میں سست یا تیز تبدیلی۔ تحقیق سے یہ پتا چلا ہے کہ بولیوں کو سمجھنے میں یہ زیروبم (modulation) اہم رول ادا کرتے ہیں۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی بچے کی قوتِ گویائی میں درپیش دقتوں کی کوئی ظاہری وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے اور خصوصاً تب جب بچے میں کوئی جسمانی یا نفسیاتی نقص بھی نظر نہیں آتا ہو۔ حتیٰ کہ بچے میں اشاراتی non-verbal صلاحیتیں بھی کافی ہوتی ہیں۔ NBRC کی سائنس داں محترمہ نندنی چٹرجی سنگھ کہتی ہیں: ''ہم امید کرتے ہیں کہ اس سافٹ ویئر سے گویائی سے متعلق امراض کے معالج (speech therapist) اور ماہرِ لسانیات دونوں کو مدد ملے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے ہمیں بولی کی شناخت کرنے والے بہتر آلات تیار کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ یہ صرف بچوں کے لیے ہی نہیں ہوگا، بچوں کا یہ مسئلہ تو محض ایک مثال کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ تحقیق جیوں جیوں آگے بڑھے گی اس کے اطلاق کی مزید صورتیں سامنے آئیں گی۔''

ایک مقبولِ عام نظریہ یہ ہے کہ قوتِ سامعہ درست ہونے کے باوجود یہ بچے مختصر یا تیز رفتاری سے ادا کی گئی آوازوں کی تفریق کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ چونکہ انسان سنے ہوئے الفاظ کی بنیاد پر ہی بولتا ہے لہٰذا یہ سافٹ ویئر ایسے بچوں کی بولی کے تجزیے میں کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس سے اس بات کے ادراک میں مدد مل سکتی ہے کہ مختصر یا تیز رفتاری سے ادا کی گئی آوازیں ان کی بولی سے غائب تو نہیں ہو گئی ہیں۔ اس تجزیے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ بچے کیا سنتے ہیں نیز اس عمل میں قوتِ گویائی میں کسی قسم کی ابتدائی خرابی کے اشارے بھی مل جاتے ہیں۔

اس تجزیے سے برآمد نتائج کی بنیاد پر NBRC علاج کی اگلی کڑی کے نقوش سوچ پذیر ہونے کے سلسلے میں پُر امید ہے۔ خیال یہ ہے کہ اس سافٹ ویئر کو مختلف صورتِ حال میں استعمال کیا جا سکے۔ ایسی کچھ مثالیں ہیں: صوتی اعتبار سے ہندستانی زبانوں کی درجہ بندی، مختلف زبانوں کے لیے بولی کا سراغ لگانے والے عمدہ آلات کا بندوبست اور دفاعی شعبے میں اس کا استعمال۔

علاوہ ازیں NBRC کا انسانی بولیوں کے اشاروں کے خدوخال کشید کرنے کا بھی منصوبہ ہے جسے مختلف ذرائع سے حاصل شدہ بولیوں کے اشارات کو سمجھنے کے لیے استعمال کیا جا سکے گا۔ یہ ابھرتے ہوئے Neuro-Informatics کے شعبے کی ایک مثال ہے جو نیوروانفارمیٹکس کو لونی مادے (genome) کے درجے سے لے کر انسانی حرکات و سکنات کی حد تک جوڑنے میں کوشاں ہے۔ بین المضامین (Interdisciplinary) تحقیق کا یہ شعبہ'' دماغ کے ذریعے سیکھنے'' کو'' دماغ کے بارے میں جاننے کے علم سے جوڑتا ہے۔ دماغ میں اطلاعات کی Processing کا مطالعہ کر کے سائنس داں انجینئرنگ کے نئے نئے نمونے ایجاد کر رہے ہیں۔ انسانی دماغ کی حرکیات کو سمجھ پانا گرچہ ایک دور رس کام ہے مگر اعلا مقصد ہے۔ اعصاب کے مصنوعی جال کی تیاری اس کی ایک مثال ہے۔ نیوروانفارمیٹکس، امریکہ کے تحقیقی پروگرام Human Brain Project کا ایک کلیدی جزو ہے۔ اس پروجیکٹ کا خرچ حکومتِ امریکہ کی اہم ایجنسیاں برداشت کر رہی ہیں۔ دماغ کو اسکین (scan) کرنے کی تازہ تکنیکوں سے حاصل بے شمار ڈاٹا بیس (database) کی بدولت اشارات (signals) کو عمل میں لانے کے نئے نئے طریقوں کی اختراع کے امکان روشن ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان سے ترسیل کے نئے نئے عکسی اور تفاعلی ذرائع (Visual and interactive means) بھی متوقع ہیں۔

اس چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مختلف النوع جنسوں کے اعصابی نظام کے بارے معلومات یکجا کرنے کے لیے نئے باثر طریقۂ کار کا استعمال کیا جائے۔ ان معلومات کی پیش کش، نمونہ سازی اور ترسیل کے بھی مؤثر طریقۂ کار تلاش کرنے ہوں گے۔

محترمہ نندنی چٹرجی سنگھ کا خیال ہے کہ'' اعصابی اطلاعات کی تحقیق کا مقصد محض یہ نہیں ہے کہ انسانی دماغ کے کام کرنے کے طریقے کے سلسلے میں چند کلیدی اصول دریافت کر لیے جائیں بلکہ ایسے نئے مصنوعی نظام کی تخلیق کرنا ہے جو حقیقی دنیا سے دانش مندانہ طور پر ہم آہنگ ہو سکے۔ تاہم، جو وصف علمِ اعصابی — اطلاعات کو منفرد بناتا ہے وہ علمِ اعصاب اور مواصلاتی تکنیک کا دوطرفہ تعلق ہے۔

بہتر سافٹ ویئر ڈاٹا (data) کا بہتر تجزیہ کر سکیں گے اور ان کی مدد سے دماغ کی کارکردگی کو بہتر طور سے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ نتیجتاً انسانی دماغ کے مساوی کمپیوٹر تیار کیے جا سکیں گے۔

صحت اور بیماری دونوں ہی حالتوں میں ذہن کی بناوٹ، کارکردگی اور نشوونما اور ادراک بلاشبہ اکیسویں صدی کے اہم چیلنجوں میں سے ایک ہے۔ NBRC ایسا پہلا ہندستانی ادارہ ہے جو علمِ اعصاب کی نشوونما، تحقیق اور اس کے فروغ کے تئیں وقف ہے۔

(بشکریہ'' دی پائنیر، نئی دہلی- 27/جولائی-2003)

مترجم کا پتہ: 250, Jhelum Hostel, JNU, New Delhi-67

محمد ولی رحمانی

ابوالفیض سحر

ابوالفیض سحر صاحب بزمِ حیات سے اٹھ کر چلے گئے۔ اِنَّالِلہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون—جانا تو سب کو ہے بس آگے پیچھے کی بات ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

سحر صاحب سے میرے بڑے تعلقات رہے ہوں، ایسا نہیں ہے، بس گنتی کی چند ملاقاتیں اور ان ملاقاتوں کے دھندلے دھندلے سے نقوش حافظے کی گرفت میں ہیں، پھر بھی ان کے انتقال کی خبر ملی، تو دل کو چوٹ لگی، ایک بہت شریف، بڑا کارگزار آدمی چلا گیا۔ انسانوں کی بھیڑ میں انسان ذرا مشکل ہی سے مل پاتا ہے، اور سحر صاحب جیسا انسان ڈھونڈے نہیں ملتا۔

جانتا ان کو عرصے سے تھا، شاید 65-66 سے، ان کی تحریروں کے ذریعے ان سے شناسائی ہوئی تھی۔ صاف ستھرا قلم، نہ تحریر میں الجھاؤ، نہ فکر میں ژولیدگی، دیکھا دیکھی بہت بعد میں ہوئی، جب وہ وزارتِ داخلہ میں کارگزار تھے، میں انھیں جانتا تھا، پہچانتا نہ تھا، کہ یہی ہیں جناب ابوالفیض سحر۔ مسلم پرسنل لا بورڈ سے متعلق کوئی کام تھا، اور بورڈ کی تحویل میں یہ خادم ایسے کاموں کے لیے فٹ سمجھا جاتا تھا، جہاں پہنچنے میں دشواری ہو، وہاں رسائی کے لیے میرے پاس ایم۔ایل۔سی۔ کا لیبل تھا جس سے کسی بھی دفتر میں اعلا و ادنا منصب داروں تک پہنچ جانا گویا میرے منصب کا ایک حق تھا، اور بورڈ کے اس خادم نے اپنے لیے تو کبھی نہیں، مگر دوسروں کے لیے خاص کر بورڈ کے لیے برابر اس کا استعمال کیا، اور بھرپور استعمال کیا۔ بورڈ سے متعلق کوئی بات تھی، مجھے بھیجا گیا اور وزارتِ داخلہ کی بھاری بھرکم رکھ رکھاؤ والی عمارت کے ایک کمرے میں پہنچ گیا، وہاں کرسی والے صاحب سے جب میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے محمد ولی رحمانی کہا، تو تعارفی کلمات سننے سے پہلے وہ تیزی سے کھڑے ہوگئے، مصافحے میں گرم جوشی کا اضافہ ہوتا گیا۔ ''اچھا آپ ہیں'' محسوس ہوا کہ وہ اس نام سے واقف ہیں، مگر میری مشکل یہ تھی کہ میں اب تک انھیں پہچان نہ سکا تھا، انھوں نے بڑے شستہ لہجے میں کہا'' مجھے ابوالفیض سحر کہتے ہیں، میں یہاں......'' ابھی ان کا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ میں نے کہا'' آپ جیسے اہلِ قلم بھی ان کرسیوں میں پھنس جاتے ہیں۔'' بڑی معصوم سی ہنسی ہنستے ہوئے انھوں نے پوچھا'' آپ نے مجھے کہاں پڑھ لیا۔'''' جناب! تحریر کی مار بڑی دور تک جاتی ہے، برسوں سے آپ کو جانتا ہوں، لکھا پڑھا کم ہے، اس لیے آپ کو بھی کم ہی پڑھا ہے، ہوسکتا ہے میرے کم پڑھنے میں آپ کے کم لکھنے کا جرم بھی شامل ہو، مگر آپ کی تحریروں میں آپ سے مل چکا ہوں۔'' وہ محظوظ بھی ہوئے اور مسرور بھی، کہنے لگے آپ کے خطرناک بیانات میں نے دیکھے ہیں، حیدرآباد میں مدرسے کے نصاب پر آپ کا مقالہ بھی پڑھا ہے، مگر آپ کے بعض بیانات سے تو ڈر لگتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ سحر صاحب کا جادو مجھ پر چل سکتا ہے، مگر وزارتِ داخلہ والے مجھ سے ڈریں، یہ میرے لیے دنیا میں اعتماد و امتحان اور آخرت میں سرفرازی کا ذریعہ ہے۔ خوب ہنسے، جی کھول کر ہنسے، پھر ہم لوگوں کی گفتگو میں چائے شامل ہوگئی، گفتگو کی حرارت اور سحر صاحب کے خلوص کی شدت میں دفتر والے آداب پگھل گئے، اور لگا جیسے پرانے روابط تازہ ہوگئے ہوں۔ اب نہ وہ افسر تھے اور نہ میں ایم ایل سی، نہ بورڈ کا نمائندہ، کتابوں کی باتیں ہوتی رہیں، موضوعات پر گفتگو چلتی رہی، وہ بھی شاید کاموں کے بوجھ سے اپنے کو الگ کرنا چاہتے تھے، ڈھائی تین گھنٹے محسوس ہوا کہ بس گزر گئے۔ اس دن پہلی مگر بڑی اچھی ملاقات رہی ابوالفیض سحر صاحب سے، اور یہ میری ان کی طویل ترین ملاقات تھی، کاموں کے ہجوم اور زندگی کی بھاگ دوڑ میں وقت کہاں ملتا ہے، جہاں دل کھول کر ذوق و مزاج کے مطابق بات کی جائے۔ اسے حسنِ موقعہ کہیے کہ سحر صاحب سے بڑے اچھے وقت میں ملاقات ہوگئی، اور ملاقات نے بہت جلد تعلقات کی شکل اپنالی۔ سرکاری نوکری سے سبکدوش ہوئے تو سحر صاحب عالمی اردو کانفرنس سے وابستہ ہوگئے، یہ اسی دور کی بات ہے۔ ان سے بس کہیں سرراہے ملاقات ہوگئی، کہنے لگے دفتر آئیے، میں کچھ چیزیں دکھاؤں گا۔ اگلے دن دفتر پہنچ گیا، انھوں نے کمپیوٹر کا شعبہ دکھایا اور کوشش کی کہ میں کمپیوٹر کی افادیت سمجھ لوں۔ وہ اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، مجھے سحر صاحب کے سمجھانے کی صلاحیت اور بے پناہ خلوص نے متاثر کیا۔ ملاقاتیں طویل وقفوں سے ہوتی رہیں، کچھ مشورے کچھ پروگرام سامنے آتے رہے، پڑھے لکھے، کچھ کام کا جذبہ رکھنے والے جب ملتے ہیں، تو ہاتھ کے ہاتھ کوئی نہ کوئی پروگرام بھی بن جاتا ہے، یہ ذہنی عیاشی کا بہترین طریقہ ہے، اور کام نہ کرنے کے باوجود اپنے آپ کو مصروف رکھنے کا آزمودہ نسخہ! انھوں نے کئی پروگرام پیش کیے، بڑے خلوص کے ساتھ ان کے فائدے سمجھائے، میری یہ دلخراش رائے جب انھوں نے سنی کہ یہ سب ذہنی عیاشی ہے، تو نہ ملول ہوئے نہ کبیدہ خاطر، بڑی محبت سے کہا'' سوچ اقدام کا پہلا قدم ہے۔'' انھوں نے مجھے قائل کرکے چھوڑا!

بولنا سب جانتے ہیں، سب ہی بولتے ہیں، مگر الفاظ کی امانت کا سلیقے کے ساتھ استعمال نیز حا فن ہے۔ پھر احساسات، واردات اور خیالات کے لیے چیلے لفظوں کے انتخابات کے ساتھ ان کی ترتیب بھی مشکل کام ہے جس کے لیے ریاض کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی پر بس نہیں آواز اور انداز سے بھی بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ چنے ہوئے الفاظ، اچھی ترتیب، مسحور کن آواز اور دل کو چھو لینے والا انداز کسی میں جمع ہو جائیں، تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے، سنانے والے کے خیالات سے آدمی بندھ سا جاتا ہے...... ان خوبیوں کا اچھا خاصا حصہ قدرت نے سحر صاحب کے حوالے کیا تھا، اس لیے ان کی گفتگو بڑی پیاری ہوتی تھی جس نے شخصیت کو جاذب بنا دیا تھا۔ یہ بھی بڑی بات تھی، کہ وہ ان صلاحیتوں کو معاملات الجھانے کے لیے نہیں سلجھانے کے لیے استعمال کرتے تھے، ورنہ ذہانت اور صلاحیت آج کل تخریبی راہوں سے گزرنا زیادہ پسند کرتی ہے۔

انھیں خانقاہی نظام سے بھی دلچسپی تھی۔ دین کے عملی پہلوؤں سے ان کا کتنا تعلق تھا اس کا مجھے صحیح اندازہ نہیں ہو سکا لیکن اگر شرافت، سادگی، محبت، دوسروں کے کام آنے کا جذبہ دین کا حصہ ہے اور خدمت عبادت ہے، اور یقیناً ہے، تو بلاشبہ وہ دیندار انسان تھے، اور خانقاہی نظام سے ان کی دلچسپی واقعی اور عملی تھی۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ انسان کی تربیت اور مشکل حالات میں جمنے اور کھڑے رہنے میں خانقاہی مزاج سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ایک بار بات بات میں انھوں نے پوچھ لیا کہ خانقاہیں تصوف کی تربیت گاہیں ہیں، کیا تصوف نے ترک دنیا کی تعلیم دی ہے؟ عرض کیا کہ تصوف صرف طریق عبادت نہیں، طرز زندگی بھی ہے، اور زندگی سلیقے کے ساتھ بسر کرنا خود عبادت ہے ۔

محو تسبیح تو سب ہیں مگر ادراک کہاں
زندگی خود ہی عبادت ہے مگر ہوش نہیں

تصوف باہمہ اور بے ہمہ کا ذوق بناتا ہے، دوسروں کی جائز ضرورتوں میں ہر ایک کے ساتھ، لایعنی میں سب سے الگ تصوف تربیت کرتا ہے کہ دل صرف اور صرف خدا اور رسول کی محبت کے لیے، اور ہاتھ پیر آنکھ کان، اور دماغ وغیرہ خالق اور خلق کی خدمت کے لیے۔ دل میں جب دوسروں کی محبت در آئیگی، تو گڑبڑی کا چور دروازہ کھل جائے گا۔ اور آج کل یہ چور دروازہ ہی مین گیٹ بن گیا ہے، مسائل کی جڑ یہی ہے۔ مدرسے کی زبان میں وضع الشئ فی غیر محلہ کا مزاج بن گیا ہے اس لیے آسانیوں نے پریشانیاں پیدا کردی ہیں، وسائل نے مسائل کھڑے کر دیے ہیں، خانقاہیں، جماعتوں اور اداروں کو جب تک وسائل کے درجے میں رکھا جائے گا، معاملہ ٹھیک رہے گا، جب انھیں منزل بنالیا جائے گا تو دشواریاں ہوں گی.......... سحر صاحب کہنے لگے یہ تصوف کی بڑی پیاری تشریح ہے اور خانقاہ رحمانی کا جو مزاج و انداز ہے، اس نے روحانی تربیت کے ساتھ زندگی برتنے کی جو تہذیب سکھائی ہے، جو سیاسی سماجی خدمات انجام دی ہیں، اس کے سجادہ نشیں کی یہ تشریح قابل قدر ہے، مگر کیا لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں؟ عرض کیا کہ یہ قصور سمجھ کا ہے، تصوف اور خانقاہوں کا نہیں۔

انھیں ہمارے ادارے رحمانی فاؤنڈیشن سے بڑی دلچسپی تھی، اس کی سرگرمیوں کو سن کر خوش ہوتے ایک بار بڑی محنت سے انھوں نے فاؤنڈیشن کے لیے بڑی اچھی اسکیم مرتب کی، مجھے فون پر تفصیلات بتائیں، میں نے کہا کہ لکھ دیجیے، انھوں نے بڑی محنت سے ادارے کا تعارف، پروگرام اور اسکیم کو خالص دفتری اور سرکاری انداز پر مرتب کر کے مجھے بھیج دیا۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ رحمانی فاؤنڈیشن خوب پھلے پھولے، اس لیے یہ محنت اور کرم فرمائی کی۔ دوسروں کے کام آنے کا جذبہ جوان کا مزاج تھا، یہ کرم فرمائی اسی کا ایک نمونہ تھی...... جب ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ حکومت سے مدد لینے کو میں درست سمجھتا ہوں، مگر جہاں "حکومت گردی" کا خطرہ موجود ہو، وہاں طاقتِ پرواز کو قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ وہ سمجھ گئے، اور کبھی پلٹ کر اس اسکیم کے بارے میں نہ پوچھا کہ کیا ہوا؟

وہ ترقی اردو بورڈ (گورنمنٹ آف انڈیا) سے وابستہ رہے تھے، اور وزارت فروغ انسانی وسائل کے شعبے NCPUL کے کاموں سے دلچسپی لیتے تھے۔ انھوں نے اسی شعبے سے رحمانی فاؤنڈیشن میں کمپیوٹر لگانے کی تجویز پیش کی، اور مجھے آمادہ کیا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ صاحب سے ملاقات کرلوں۔ بھٹ صاحب سے کوئی شناسائی نہ تھی، وہ ڈائرکٹر تھے، اور بحمد للہ آج بھی ہیں۔ قصہ مختصر میں نے ان سے ملاقات کی، پہلے انھوں نے افسرانہ آہنگ میں ٹالنے کی راہ اپنائی، مگر جلد ہی ان کی شرافت، کام کرنے کی جرأت و صلاحیت اور واقعیت پسندی نے رحمانی فاؤنڈیشن مونگیر میں کمپیوٹر سینٹر قائم کرا دیا۔ یہ بھٹ صاحب بھی بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں، مرکزی حکومت میں بڑی چھوٹی کرسیوں پر بہت سے افسر کام کر رہے ہیں، مگر انھوں نے وزارت کے ایک شعبے کو اس طرح بڑھایا کہ، اس کے اثرات پورے ملک میں محسوس کیے جا رہے ہیں۔ یہ ان کی ذہانت اور طریق عمل کی چابکدستی ہے کہ جوانوں، بوڑھوں، اور بڑے بڑوں کو ادارے کی کارکردگی میں شامل کر رکھا ہے، اور حکومت کے چھوٹے سے شعبے کو تحریک کا انداز دے دیا ہے۔

دو سال پہلے کی بات ہے، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ صاحب نے دلی میں آل انڈیا اردو کانفرنس کی۔ کانفرنس کی آخری شام کا اجلاس وزارت فروغ وسائل انسانی کے وزیر جناب مرلی منوہر جوشی کی کوٹھی پر منعقد ہوا۔ ملک کے منتخب ستر، اسی حضرات ہوں گے، پانچ چھ صاحبان کو تقریر کا موقع دیا گیا اور وقت ڈیڑھ سے دو منٹ تک۔ اچھا بولنا مشکل کام ہے، مگر مختصر بولنا بہت مشکل ہے، مقررین اور سامعین (جو خود بھی مقرر تھے) کرب تقریر کی لذتوں کو جھیل گئے، میں نے بھی

ڈیڑھ منٹ میں تین تجویزیں پیش کیں، جن میں ایک تجویز خاصی مرچ آلود تھی۔ آخر میں اسٹیج والوں کا نمبر آیا، جوش صاحب کھل کر بولے، کانفرنس ختم ہوگئی، مصافحے کے لیے جوش صاحب بڑھے، شروع میں ہی میرا نمبر آیا ہاتھ ملایا، چکھ آنکھ بھی ملی، مسکرا کے کہا کہ" خطرناک مولانا ہیں۔" میں نے بھی جملہ چلایا" ہم دونوں برہمن ہیں، دونوں ہی خطرناک ہیں، قہقہوں میں بات آئی گئی ہوگئی۔

جوش صاحب کے سرکاری دولت کدے سے باہر نکلے تو سحر صاحب نے پوچھا کیا کھسر پھسر ہو رہی تھی؟ میں نے بتایا کہ برہمن واد ہو رہا تھا۔ " مطلب؟" ان کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا، میں نے جملوں کو دہرایا، ہنسے، خوب لطف لیا، کہنے لگے۔" آپ بھی بخشتے کب ہیں!" پروفیسر جعفر رضا صاحب (الہ آباد) تشریف لے آئے، میں نے تجویز رکھی کہ اس وین میں ہم چاروں کی بڑی اچھی کانفرنس ہو جائے گی۔ پچھلے حصے میں ڈبل سیٹ والی مارونی وین کا صحیح فائدہ اسی دن اٹھایا۔ چاروں روبرو ہوگئے اور شعر وادب کی بات چل پڑی، دونوں حضرات کو اپنے اپنے پڑاؤ پر پہنچا کر ابوالفیض سحر صاحب کے گھر پہنچے، وہیں ان سے کھڑے کھڑے باتیں ہوئیں اور اجازت لے کر میں قیام گاہ کو چل پڑا، نہیں جانتا تھا، یہ ان سے میری آخری ملاقات بن جائے گی۔

پھر فون سے باتیں ہوتی رہیں، پروگرام بنتے رہے۔ ایک بار کسی کالونی کے کاموں کی بسم اللہ کرانے کے لیے محبت آمیز اصرار کے ساتھ مجھے بلایا، مگر موقع نہ تھا، میں نے معذرت کرلی۔ پھر کوئی اور مناسبت تھی، میری پچھلی معذرت کا حوالہ دیتے ہوئے اصرار کے ساتھ دہلی بلایا، مگر اس موقعے پر بھی معذرت ہی میرے حصے میں آئی، بھاگ دوڑ کی زندگی اور فرائض سے آباد اوقات میں ایسی طلب صادق پر بھی جی کڑا کر کے معذرت کرنا پڑتی ہے۔ ان کا بھی وعدہ مونگیر سفر کا تھا، جو آج کل پر ٹلتا رہا، اب وہ اس سفر پر جا چکے ہیں، جس کی راہ میں مونگیر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف فرمائے، حسنات کو قبول کرے، اور اپنی رحمت میں ڈھانپ لے۔ (آمین)

Khanqah-e-Rehmani,
Monger-811201

□□□

دیوناگری اور تصویروں کی مدد سے اردو سکھانے والی کتاب

اردو تصویری لغت مع ہندی

جدید طریقوں سے تیار کردہ کتاب۔ اردو سیکھنے کے شائق حضرات کے لیے نہایت عمدہ تحفہ۔ تصاویر اور ہندی کی مدد سے اردو خود بخود سیکھی جا سکتی ہے۔ یہ اپنی طرز کی بالکل اچھوتی کتاب ہے۔ بہترین کتابت اور آفسیٹ کی طباعت کے ساتھ۔

سائز:23x38/8 صفحات:252 قیمت:-/30روپے

حیاتِ جاوید

الطاف حسین حالی

سرسید احمد خاں کے رفیق کار مولانا الطاف حسین حالی کے قلم سے سرسید احمد خاں کی زندگی کے حالات اور ان کی قومی اور مذہبی خدمات کا بیان—

چوتھا ایڈیشن

صفحات: 907، قیمت:167.00 روپے

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

سید احتشام حسین

اردو ادب کی تمام اصناف کا مختصر مگر جامع تعارف، تاریخی حوالوں کے ساتھ

طلبہ کے لیے بہ طور خاص کارآمد—

چوتھا ایڈیشن

صفحات:334، قیمت70.00روپے

شعریات

ارسطو کی بوطیقا کا ترجمہ اور تعارف

شمس الرحمٰن فاروقی کے قلم سے

ہر ادبی لائبریری میں اس کتاب کی موجودگی ضروری ہے

تیسرا ایڈیشن مع اضافۂ جدیدہ

صفحات:136، قیمت: 62.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40%کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

سید محمد اشرف

بادِ صبا کا انتظار

ڈاکٹر آبادی میں داخل ہوا۔

راستے کے دونوں جانب اونچے کشادہ چبوتروں کا سلسلہ اس عمارت تک چلا گیا تھا جو لکھیا اینٹ کی تھی اور جس پر چونے سے قلعی کی گئی تھی۔ چبوتروں پر انواع واقسام کے سامان ایک ایسی ترتیب سے رکھے تھے کہ دیکھنے والوں کو معلوم کیے بغیر قیمت کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ سامان ایسی ترتیب سے رکھے تھے کہ دیکھنے والوں کو معلوم کیے بغیر قیمت کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ سامان فروخت کرنے والے مختلف رنگوں اور نسلوں کے نمائندے تھے جو اپنی اپنی دکانوں پر چاق و چوبند بیٹھے تھے۔ چبوتروں کا یہ سلسلہ اس عمارت پر جاکر ختم نہیں ہوتا تھا بلکہ عمارت کے دوسرے رخ پر اسی طرح کے چبوترے انواع و اقسام کے سامان کے ساتھ سجے ہوئے دور تک چلے گئے تھے۔ راستے میں گٹھیلے بدن کے مرد، کندھے پر مشکیزے لٹکائے ہاتھوں میں کٹورا پکڑے بجا رہے تھے اور چھڑکاؤ کرتے پھر رہے تھے۔ خریدار مختلف قبیلوں، گروہوں اور رنگوں کی پوشاک پہنے اس چبوترے سے اس چبوترے تک آجارہے تھے۔ راستہ طرح طرح کی شیریں، نرم، سخت، کرخت، بھدی، چیختی ہوئی، دکھی سکھی آوازوں سے بھرا ہوا تھا۔

لکھیا اینٹ کی سفید عمارت کی دیواریں ناقابلِ عبور حد تک اونچی نہیں تھیں۔ ان میں جگہ جگہ در، دریچے اور روشندان تھے اور ان سے آتی ہوئی ہُو حق کی پراسرار گونج دار آوازیں بازار میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ بازار میں کھڑے ہوکر ان آوازوں کو سن کر ایسا لگتا تھا جیسے ان آوازوں کے جسم ہوں اور ان جسموں پر دراز سفید ریشم جیسی داڑھیاں ہوں اور کانوں سے نیچے تک کھیلتی ہوئی نرم نرم کاکلیں ہوں۔ ان آوازوں کو سن کر ایک ایسے سکون کا احساس ہوتا جو سخت لو میں، کوسوں کا سفر پاپیادہ طے کرنے کے بعد ٹھنڈی صراحی کا سوندھا سوندھا پانی سیر ہوکر پینے پر ملتا ہے۔ نیچی نیچی دیواروں والی اس نورانی عمارت کو چاروں طرف سے ستونوں، برجیوں، مناروں اور پھاٹکوں نے گھیر رکھا تھا جو بظاہر کسی محل کی موجودگی کا احساس دلاتے تھے۔ کسی نے شاید بہت کوشش کی بھی نہیں اور اگر کرتا بھی تو غالباً یہ جاننا بہت مشکل ہوتا کہ بازار اس سفید عمارت کو گھیرے ہوئے ہے یا بازار اس سفید عمارت کا باہری حصہ ہے یا یہ دونوں ستونوں اور مناروں والی عمارت کے ناقابلِ تقسیم حصے ہیں۔ یہ تینوں کسی واحد نقشے کی بنیادی لکیروں کی طرح ایک دوسرے سے متصل اور مسلسل تھے۔ محل نما عمارت کے اندر سے کبھی کبھی تیز آوازیں بلند ہوتیں جو سفید عمارت کے 'ہو حق' اور بازار کی آوازوں کے ساتھ مل کر محل کی سب آوازوں کو ڈھانپ لیتیں۔

ڈاکٹر نے ہاتھ لگا کر جبّہ برابر کیا، گلے میں پڑے آلے کو ٹٹول کر محسوس کیا اور ہاتھ میں تھامے بیگ کو مضبوطی سے پکڑے اس اونچے مستطیل کمرے میں داخل ہوگیا جو اس آبادی اور عمارتوں کے عین درمیان میں واقع تھا۔ ایک لمحہ کو ٹھٹھک کر اس نے کمرے کی سوگوار ٹھنڈی خاموشی بھری فضا سے خود کو ہم آہنگ کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس بے پناہ حسین کمرے کو دیکھ کر سہم گیا ہو۔ کمرے کے درمیان مدوّر پایوں کی ایک بڑی اور حسین مسہری پڑی تھی جس کے سرہانے کے سیاہ حصے میں نفیس کام بنا ہوا تھا۔ مسہری پر قیمتی اور مرعوب کرنے والا بستر لگا ہوا تھا اور اس بستر پر وہ بدن رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک دراز قد نہایت حسین و جمیل خاتون تھی۔ اس کے بال ترکی نژاد عورتوں کی طرح سنہرے تھے جن سے عمر کی شہادت نہیں ملتی تھی۔ اس کی پیشانی شفاف اور ناک ستواں اور بلند تھی۔ آنکھیں نیم وا اور سرمگیں تھیں۔ ہونٹ اور رخسار بیماری کے باوجود گلابی تھے۔ ہونٹ بھی نیم وا تھے اور سفید موتی سے دانت ستاروں کی طرح سانس کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ رہ رہ کر دمک رہے تھے۔ شفاف گردن پر نیلگوں مہین رگیں نظر آرہی تھیں اور گردن کے نیچے کا عورت حصہ اٹھا ہوا اور مخروطی تھا۔ ساعد سیمیں کولھوں کے ابھار سے لگے ہوئے رکھے تھے۔ ڈاکٹر نے غور سے اس کے ہاتھوں پیروں کو دیکھا اور ایک عجیب بات محسوس کی کہ خاتون کے بھرے بھرے ہاتھ اور پیر محنت کے عادی ہونے کی غمازی کررہے تھے لیکن انھیں نرم اور صاف ستھرا رکھنے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ مریضہ کی سانس بے ترتیب تھی۔ کئی کئی لمحوں تک بدن ساکت نظر آتا پھر یکا یک جھٹکے کے ساتھ بے ترتیب سانسیں آنے لگتیں۔

مسہری سے لگا ہوا وہ دراز قد شخص استادہ تھا جس کے سر اور بالوں کو ایک گوشے دار کلاہ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ سرخ و سفید معمر چہرے پر خوبصورت داڑھی تھی جو بالترتیب نہیں تھی۔ اس شخص کی آنکھوں میں جلال و جمال کی پرچھائیاں رہ رہ کر چمکتی تھیں۔ اپنی شخصیت اور لباس سے وہ کبھی بادشاہ لگتا کبھی درویش۔ ڈاکٹر مسہری کی دوسری طرف اس شخص کے مقابل سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

ڈاکٹر دیر تک مریضہ کو دیکھتا رہا۔ وہ شخص متفکر آنکھوں سے مریضہ کو ایک ٹک دیکھے جارہا تھا۔ دفعتاً ڈاکٹر کو احساس ہوا کہ اس بڑے مستطیل کمرے کے چاروں طرف بہت سے کمرے ہیں جن پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ان پردوں کے پیچھے چوڑیوں کی کھنکھناہٹ دھیمی دھیمی مفہوم سرگوشیاں اور دبی

دبی آہیں سنائی دے رہی ہیں۔ کسی کسی کمرے میں نوعمر بچوں کی شور مچانے والی آوازیں بھی بلند ہورہی تھیں۔ جب ان آوازوں کا شور ایک خاص آہنگ سے زیادہ بلند ہوجاتا تو دراز قد شخص کے ماتھے پر ناگواری کی لکیریں کھنچ جاتیں۔ ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ پردے کے پیچھے سے بلند ہونے والی سرگوشیاں قابل فہم ہیں لیکن ان کا تعلق کسی ایک زبان سے نہیں ہے۔

ڈاکٹر نے قدرے توقف کے بعد مرض کا حال جاننے کے لیے اس شخص کے رشتے کے بارے میں سوچا۔

''یہ...... آپ کی کون ہیں؟''

''عزیزہ ہیں۔''

''کیا؟''

''عزیزہ کا مطلب بہت عزت والی اور بہت پیاری بھی۔''

''آپ سے سمبندھ کیا ہے؟''

''میں ہی رب مجازی ہوں۔''

ڈاکٹر آنکھیں پھیلائے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر آواز صاف کرکے بولا۔'' ڈاکٹر ہونے کے ناطے مجھے جاننا چاہیے کہ روگی کو کیا روگ ہے۔ روگ کے بارے میں جاننے کے لیے آپ سے ان کے سمبندھ کے بارے میں پوچھنا آوشیک ہے۔ آپ جو سمبندھ بتا رہے ہیں، وہ میری سمجھ میں نہیں آسکا۔''

دراز قد انسان تکلیف کے ساتھ مسکرایا۔

''آپ معلوم کیجیے جو کچھ میرے علم حضوری میں ہے، آپ کے روبرو پیش کروں گا۔''

ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات سے محسوس ہورہا تھا کہ وہ اس جملے کو مکمل طور پر نہ سمجھ پانے کے باوجود مطمئن ہے کہ وہ شخص مریضہ کے بارے میں بہت کچھ یا سب کچھ جانتا ہے۔

''یہ دشا کب سے ہے؟''

''بہت عرصے سے۔''

پھر دیر تک خاموشی رہی۔ خاموشی اور زیادہ گہری محسوس ہونے لگی تھی کہ برابر کے کمروں سے اسی قابلِ فہم مگر نامانوس زبان میں سرگوشیاں بلند ہورہی تھیں۔

دراز قد انسان نے ڈاکٹر کے چہرے پر پریشانی پڑھی اور اس بار وہ تفصیل سے گویا ہوا۔

''عزیزہ...... میری مراد مریضہ نے مدتوں سے غذا کو منہ نہیں لگایا۔ گھریلو نسخوں سے تیار شدہ ادویات ہونٹوں تک تو پہنچ جاتی ہیں لیکن معدے تک نہیں جاپاتیں۔ مریضہ اپنے مرض کا اظہار بذات خود کبھی نہیں کرتیں۔ کبھی کبھی جلدِ بدن بخار کی شدت سے سرخ ہوجاتی ہے۔ ہاتھ رکھ کر محسوس کیا جائے تو تھوڑی ہی مدت میں بدن نم اور برف کی طرح سرد ہوجاتا ہے اور زندگی کے سارے آثار ختم ہوتے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ تنفس کی بے ترتیبی تردد کا سب سے بڑا سبب ہے۔''

''کس چیز کی بے ترتیبی؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

تنفس کی'' مراد سانسوں کی بے ترتیبی۔''

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی اور جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''کیا میں روگی کو آلہ لگا کر دیکھ سکتا ہوں؟''

''ضرور۔ عزیزہ کبھی بھی پردہ نشین خاتون نہیں رہیں۔''

مریضہ کی سانسیں اس وقت نسبتاً معمول پر تھیں۔ ڈاکٹر نے سینے پر پڑے کام دار دوپٹے کو تہذیب سے ایک طرف کیا اور سینے پر آلہ رکھ کر غور سے سنا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے جلدی سے آلہ ہٹایا اور کان لگا کر کمرے کے ہر کونے سے ابھرتی مہین سے مہین آواز کو سننا چاہا۔ کمرے میں سانسوں کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں تھی۔ اس نے پھر آلہ لگایا۔ اس کے چہرے پر پھر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ دیر تک آلے کو سینے پر رکھے آنکھیں بند کیے کچھ سنتا رہا۔ مریضہ کے چہرے پر، جتنے وقت تک آلہ رہا اطمینان رہا۔ ڈاکٹر نے آلہ ہٹایا اور بے چین آواز میں بولا۔

''روگی کا دل بہت اچھی حالت میں ہے۔ کسی روگ کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔''

دراز قد انسان کے چہرے پر کوئی تحیر نمودار نہیں ہوا۔

''کیا اس بات سے آپ کو اچرج نہیں؟''

''نہیں'' دراز قد انسان کا جواب مختصر تھا۔ ڈاکٹر کو اس جواب کی امید نہیں تھی لیکن اس نے خود کو سنبھالا اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

''اب جو بات آپ کو بتاؤں گا، اسے سن کر آپ اچھل پڑیں گے۔ روگی کے دل سے سنگیت کی لہریں نکل رہی ہیں، جنھیں میں نے کئی بار سنا۔''

دراز قد انسان دھیمے سے وقار کے ساتھ مسکرایا اور آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔

دراز قد انسان کے اطمینان پر ڈاکٹر کو حیرت ہوئی لیکن اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

''ہردے کی چال سے جو دھن پھوٹ رہی تھی، اس میں ندی کے بہنے کی کل کل تھی۔ ہوا کی مدھری سرسراہٹ تھی، پنچھیوں کی چہکار تھی ...''

دراز قد انسان نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ڈاکٹر کو محسوس ہوا کہ دراز قد انسان کسی پچھلی بات کو یاد کرکے کہیں کھو گیا ہے۔ دراز قد انسان گویا ہوا۔

''اس آواز میں میدانِ جنگ میں طبل پر پڑنے والی پہلی ضرب کی آواز کا ارتعاش بھی ہوگا۔ دو محبت کرنے والے بدن جب پہلی بار ملتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنے ہونٹوں سے محسوس کرتے ہیں، وہ نرم لذت بھری آواز بھی ہوگی۔ ملاگیری رنگ کی عبا پہنے صوفی کے نعرۂ مستانہ کی گونج بھی ہوگی۔ دربار میں خوں بہا کا فیصلہ کرنے والے بادشاہ کی آواز کی گرج بھی شامل ہوگی۔ صحراؤں میں بہار کی آمد سے متشکل ہونے والی زنجیر کی جھنک بھی ہوگی اور بنجر زمین پر پڑنے والے موسم برشگال کے پہلے قطرے کی کھنک بھی ہوگی۔ بربط، ستار اور طبلے کی... '' وہ خاموش ہوگیا۔

''ہاں کچھ اس پرکار کی آوازیں ہیں پر انھیں شبدوں میں بتا پانا بہت کٹھن ہے۔'' ڈاکٹر بولا۔ اچانک برابر کے کمرے سے ایک نوعمر لڑکا نکلا۔

''ڈاکٹر نے لیڈی کو کیا روگ بتایا؟ اندر سے انکوائری کی ہے۔''

یہ آواز سنتے ہی مریضہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور سانسیں یکا یک بے ترتیب ہوگئیں۔ دراز قد شخص کے چہرے پر ناگواری کا دھواں پھیل گیا۔

''اندر جاؤ۔ اندر جاؤ۔ خبر دار بلا اجازت یہاں قدم نہ رکھنا۔'' نوعمر بچہ حیرت سے اسے دیکھتا ہوا اندر چلا گیا۔

ڈاکٹر نے مریضہ کے سنہرے بالوں میں کنگھی کرنے والے انداز سے جڑوں تک انگلیاں لے جا کر کاسہ سر پر ہتھیلی جمادی۔

''فیور بڑھ رہا ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ پیشانی کے پسینے کے قطروں سے اپنی ہتھیلی کو نم کرتا ہوا وہ آنکھوں تک ہاتھ لے گیا۔ انگوٹھے کے نرم پیٹ سے آنکھ کے پپوٹے کو آہستگی سے اوپر اٹھایا۔ آنکھوں کی سفیدی چمکی۔ رخساروں کی گرمی ہاتھ کی پشت سے محسوس کرتا ہوا وہ دھیمے سے بڑبڑایا۔

''شریر ٹھنڈا پڑ رہا ہے۔''

دراز قد انسان کے چہرے پر فکر کے سائے تھرتھرائے۔ وہ دھیمے سے بولا۔

''اصل مرض کا تعلق تنفس سے ہے۔''

ڈاکٹر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کچھ سوچا اور پھر مریضہ کے ابھرتے ڈوبتے سینے پر آنکھیں جمادیں اور بے ترتیب سانسوں کا معائنہ کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے سیدھے کھڑے ہوکر بہت یقین کے ساتھ کہا۔

''اس روگی کے سارے شریر میں جیون ہے۔ کیول سانس کی پرابلم ہے اور یہی سب سے بڑی پرابلم ہے۔ پھیپھڑے کی خرابی کا کوئی علاج نہیں ہے۔''

''کیا آپ کو یقینِ کامل ہے کہ اعضائے تنفس قطعاً بیکار ہو چکے ہیں؟'' ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ڈاکٹر کو آسان زبان میں سوال سمجھایا۔

ڈاکٹر نے آلہ لگا کر پہلی بار پھیپھڑوں کو دیکھا۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

''بڑی وچتر بات ہے۔ پھیپھڑے بالکل ٹھیک ہیں، پر پوری سانس نہیں لے پا رہے۔''

''پوری سانس لینے سے بدن کے دیگر اعضا کی قوت کا کیا تعلق ہے؟'' دراز قد انسان نے سوال کیا۔

''بہت بڑا سمبندھ ہے۔ تازہ ہوا جب پھیپھڑوں کے راستے رکت میں ملتی ہے تو جیون کا سروپ بنتا ہے۔ وہ جیون رکت کے ساتھ مل کر شریر کے ہر انگ کو شکتی دیتا ہے۔ پوری ہوا نہ ملے تو رکت... لال رکت تھوڑی دیر بعد نیلا پڑ جاتا ہے اور شریر کے ہر بھاگ میں روگ چھا جاتا ہے۔''

''آپ کا گمان ہے اعضائے تنفس اپنا کام بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں تو پھر بدن میں تازہ ہوا کی کمی کیوں ہے؟''

''شریر میں تازہ ہوا کی کمی اس لیے ہے کہ اس کمرے میں تازہ ہوا نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

''اس کمرے میں کھلنے والے باقی کمروں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور ان کمروں میں باہر کی طرف بے شمار کھڑکیاں ہیں۔'' دراز قد انسان نے تفصیل سے بتایا۔

''پر مجھے لگتا ہے کہ کسی کھڑکی سے تازہ ہوا نہیں آرہی۔''

دفعتاً برابر کا ایک کمرا کھلا اور ایک نوعمر لڑکی فراک اسکرٹ پہنے داخل ہوئی۔

''ماما نے پوچھا کہ لیڈی کا فیور ڈاؤن ہوا کہ نہیں؟''

مریضہ کا بدن ایک لمحے کو تڑپا اور سانس پھر بے ترتیب ہوگئی۔

''دور ہو جاؤ میری نگاہوں کے سامنے سے، نابکار۔'' دراز قد انسان شدید طیش کے عالم میں دانت پیستے ہوئے آواز کے آہنگ کو کم کرتے ہوئے بولا۔

''آپ اینگری کیوں ہوتے ہیں۔ میرے کو حال پوچھنے اندر سے ماما بھیجتی ہے۔ میری مسٹیک کدھر ہوتی۔'' لڑکی نے ناک پھلا کر احتجاج کیا۔

اس لڑکی کے الفاظ، لہجے اور آواز سے دراز قد انسان پر پاگل پن جیسا دورہ پڑ گیا۔ ڈاکٹر نے بمشکل اسے سمجھایا۔ لڑکی کو ہاتھ کے اشارے سے اندر جانے کو کہا۔

پھر ڈاکٹر بولا۔ ''میرے پاس ایک ہی دوا ہے۔ اس پرکار کے روگی کے لیے کسی بھی ڈاکٹر کے پاس ایک ہی میڈیسن ہوتی ہے۔ وہ میڈیسن دے کر پھیپھڑوں کی باریک باریک نسوں کو پھلایا جا سکتا ہے تاکہ ان میں تازہ ہوا بھلی بھانت بھر جائے۔ پر..........''

"پر کیا؟....." دراز قد انسان نے بے صبری سے پوچھا۔

"پر یہ دوا تبھی کام کرتی ہے جب روگی کو اچھی ماترا میں تازہ ہوا مل سکے۔ تبھی تو پھیپھڑوں کی پھولی ہوئی نسوں میں ہوا جا سکے گی۔ جب تازہ ہوا ہی نہ ہو تو کیول پھیپھڑوں کی نسوں کو پھلا کر کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"تب؟" دراز قد انسان نے متفکر ہو کر پوچھا۔

"اس کا کوئی اُپائے نہیں ہے۔" ڈاکٹر کا لہجہ مایوسانہ تھا۔ پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔

"کیا روگی کا کمرہ بدلا نہیں جا سکتا۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں یہ عزیزہ کا مخصوص کمرہ ہے۔ زندگی اسی میں گزری ہے۔ باہر پھیلی تمام عمارتوں کے درمیان یہ کمرہ عزیزہ کے علاوہ کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔"

"لیکن روگی کو اس کمرے کے علاوہ دوسرا کمرہ تو دے سکتے ہیں۔"

"لیکن بنا تازہ ہوا کے روگی اتنے دن تک جیوت کیسے رہا؟"

تازہ ہوا کی کمی کا مسئلہ بہت پرانا نہیں ہے۔ اس کمرے کے چاروں طرف مریضہ کے متعلقین کے کمرے ہیں۔ ان میں دریچے اور روشندان ہیں، دروازے ہیں لیکن وہ لوگ ان کو کھولتے نہیں۔"

"کیا ان لوگوں کو دوسروں سے ملنے کے لیے اپنے کمروں سے نکلنا نہیں پڑتا؟"

"نہیں۔ انھوں نے سہولت اور آرام کے پیش نظر دوسروں سے ملنے کے لیے اندر ہی اندر دیواروں میں راستے بنا لیے ہیں۔"

"پھر تو بہت اچنبھے کی بات ہے کہ روگی اب تک جیوت کیسے ہے۔ دن رات اسی پرانی ہوا میں جیوت رہنا بہت کٹھن ہے۔"

"نہیں۔ دراصل اس عمارت کے ایک کمرے میں شام ڈھلے باہر کا دروازہ کھلتا ہے اور تازہ ہوا کی ایک لہر اندر آ جاتی ہے۔ شاید اسی سے کاروبار ہستی قائم ہے۔ یوں بھی عزیزہ بہت سخت جان ہے۔" وجیہہ مرد نے بستر پر لیٹی خاتون کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے اس پرکار کا روگی پہلی بار دیکھا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان کے اور ناطے دار بھی ہیں۔ کبھی کبھی بیماری پرکھوں سے بھی مل جاتی ہے۔"

"عزیزہ کی کئی بہنیں ہیں۔ ایک بہن بہت معمر ہے۔ اس کا گھر اس ملک سے باہر ہے۔ وہ نوجوانوں کی طرح تر و تازہ ہے۔ وہ اپنے دیس کے باہر بھی عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔"

"اور؟"

"ایک بہن جو اس سے کچھ بڑی ہیں وہ بھی اس ملک سے باہر رہتی ہیں اور اپنے ملک میں بہت خوش و خرم ہیں۔ تمام تر عیش و لذت کوشی ان کی قسمت میں نوشت کردی گئی ہے۔ ایک بہن اس ملک میں بھی ہے اور بہت آرام سے ہے۔ اس کے متعلقین عزیزہ کو بھی اس کی روش پر چلانا چاہتے ہیں لیکن مریضہ کے عزیزوں نے انکار کر دیا۔"

"کیا اس بہن کے چال چلن میں کوئی برائی ہے؟" ڈاکٹر نے آلہ گردن میں لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں کوئی برائی نہیں لیکن اگر عزیزہ اس کی چال چلتی تو اپنا آپا کھو دیتی۔"

اچانک دراز قد شخص کو کچھ یاد آیا۔ وہ ہلکے ہلکے جوش کے انداز میں گویا ہوا۔ "عزیزہ کے بزرگوں میں ایک ضعیفہ ہے۔ اُن کے گھر والے انھیں بہت عزت دیتے ہیں لیکن کبھی گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ مسموع ہوا کہ وہ طاقت ور ضعیفہ محبوس ہو کر اب کمزور ہو گئی ہیں۔ ان کے متعلقین احتراماً انھیں سلام تو کر لیتے ہیں لیکن کوئی اُن کے پاس دیر تک بیٹھنا گوارا نہیں کرتا۔"

یکا یک کسی پردے کے پیچھے سے دال بھات مانگنے کی آواز آئی۔ یہ ایک شیریں نسوانی آواز تھی۔ وہ آواز تھوڑی دیر بعد رام سیتا، لنکا اور ہنومان کے قصے سنانے لگی۔

ڈاکٹر نے دراز قد انسان کو حیرت سے دیکھا جیسے اسے اعتبار نہ آیا ہو لیکن دراز قد انسان کے چہرے کے سنجیدہ تیوروں نے ڈاکٹر کا اعتماد اسے واپس کیا۔

ڈاکٹر نے مریضہ پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"آپ بتا رہے تھے کہ شام ڈھلے برابر کے کمرے کی کھڑکی سے تازہ ہوا کا جھونکا اندر آتا ہے؟"

"ہاں حالاں کہ وہ وقت شام کا وقت ہوتا ہے لیکن وہ ہوا بادِ صبا کی طرح دل خوش کن ہوتی ہے۔"

"کیا شام ڈھل چکی۔" دراز قد انسان نے بے چینی سے پوچھا۔

"نہیں ابھی کچھ دیر ہے۔ کیا آپ کو سمے بیتنے کا اندازہ نہیں ہوتا؟ دراز قد انسان خاموش رہا۔ اس سوال کے اندر ایسا کچھ تھا جس نے اسے مزید بے چین کر دیا۔

ڈاکٹر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ جب یہ نظریں سوئی بن کر دراز قد انسان کے چہرے پر جگہ جگہ کھب گئیں تب اس نے گہری اور مجبور آواز میں کہا۔

"نہیں۔"

"اچرج کی بات ہے۔" ڈاکٹر اور کچھ نہیں بول سکا۔

لیکن اس کی نگاہیں مرد کے چہرے پر جمی رہیں۔ مرد ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ دھیمے دھیمے گویا ہوا۔

''بہت دنوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر گھڑی وقتِ غروب چھایا ہوا ہے۔''

''کیا آپ بھی ہر وقت دیواروں کے بیچ بند رہتے ہیں؟'' ڈاکٹر نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

اس مرتبہ مرد کی خاموشی مہیب تھی۔ ڈاکٹر سہم کر رہ گیا۔

مرد نے ڈاکٹر کی دلی کیفیات کا اندازہ لگا لیا۔ شگفتہ لہجے میں بولا۔

''بہت سی باتیں پراسرار ہوتی ہیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں بھید پر سے پردہ ہٹا بھی دوں تب بھی آپ پوری بات نہیں سمجھ سکیں گے۔''

دونوں دیر تک خاموش رہے۔ پھر ڈاکٹر نے پہل کی۔

''میں بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جب تازہ ہوا کا جھونکا اس کمرے میں آتا ہے تو روگی کی حالت میں کس طرح کا فرق آتا ہے؟''

''شام ڈھلے آپ دیکھ لیجیے گا۔''

''شام ڈھلنے میں ابھی دیر ہے۔''

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس مرد کے علاوہ کسی اور کو خاتون کی زندگی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ مریض کی حالت پوچھنے والیوں کو اس نے دیکھا نہیں لیکن اتنا اندازہ تھا کہ وہ بھی مریض کی حالت میں بس اتنی ہی دلچسپی لے رہی ہیں جیسے لوگ موسم کی تبدیلی کے بارے میں ایک دوسرے سے معلوم کرتے ہیں۔ اس کی سمجھ کام نہیں کر رہی تھی کہ اس رعب دار مرد کی اس آبادی میں کیا حیثیت ہے۔ اس عمارت کے دوسرے مکینوں سے اس کا کیا تعلق ہے اور باہر پھیلی ہوئی اس بستی سے مرد کا کیا علاقہ ہے۔ اس کے دل میں رہ رہ کر سوال اٹھ رہے تھے لیکن وہ مرد کے لہجے کی سنجیدگی اور موقع کی نزاکت کے پیشِ نظر زیادہ سوالات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے کچھ گھما کر معلوم کرنا چاہا۔

''یہ باہر کا علاقہ کس کا ہے؟''

''کیا آپ پہلی مرتبہ آئے ہیں؟''

''جی ہاں۔ بس دور سے دیکھتا رہتا تھا۔ دیکھنے میں یہ پوری آبادی بہت اچھی لگتی تھی۔ دور سے ان عمارتوں کی اونچائی، مضبوطی اور پرانا پن من کو کھینچتا تھا۔ آج قریب سے بازار بھی دیکھا۔ رنگارنگ چیزیں، طرح طرح کی پوشاکیں، الگ الگ نسلوں کے لوگ، پھر ہو، حق کرتی سادھو سنتوں کی آوازیں۔ میں زیادہ نہیں دیکھ پاتا تھا۔ لیکن لکھیا اینٹ کی باہر کی ایک عمارت کو دیکھ کر من کو بہت شانتی ملی کہ اس آبادی میں ایسی سادگی بھی ہے۔''

''آیئے میں آپ کو آبادی کی ایک جھلک دکھا دوں۔ جب سورج ڈھلنے کا وقت قریب آجائے تب مجھے بتا دیجیے گا۔ ہم لوگ مریضہ کے پاس واپس آجائیں گے۔''

ساگوان کے سیاہی مائل اونچے دروازوں کو کھول کر وہ دونوں باہر نکلے۔ غلام گردش میں کئی طرح کے لوگ ملے لیکن کوئی ان دونوں سے مخاطب نہیں ہوا۔ ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ مخاطب کوئی نہیں ہوتا لیکن تمام افراد اس بارعب، وجیہہ اور خوش پوش مرد کو عقیدت و محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ غلام گردش کا یہ حصہ چوڑی سیڑھیوں والے ایک زینے کے مقابل تھا۔ دونوں اس پر چڑھے۔ اونچی نیچی چھتوں والی بے شمار عمارتوں کو عبور کرتے ہوئے وہ لوگ زینے پر چڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ سب سے اونچی چھت آگئی۔ چھت پر کنگورے دار حصار تھا۔ مرد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر حصار کے پاس لا کر کھڑا کر دیا۔ نیچے پوری بستی پھیلی ہوئی تھی۔ چھت پر ابھی سورج کی زرد شعاعیں تھیں لیکن نیچے— بستی میں اندھیرا اتر چکا تھا۔

ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ اندھیرا اترنے کے باوجود نیچے ابھی بھی رونق ہے۔ تب اسے محسوس ہوا کہ رونق کا لطف روشنی سے نہیں آبادی سے ہوتا ہے۔ یہ بلند اور مضبوط عمارت چاروں طرف سے بازاروں سے گھری ہوئی تھی اور اس عمارت سے متصل لکھیا اینٹ کی وہ عمارت بھی ریشم جیسے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی، جہاں اس نے ہُو حق کی صدائیں سنی تھیں۔

''یہ سب کس کا ہے؟'' اس نے نیچے آبادی پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

یہ عمارتیں، یہ ستون، یہ بالا خانے، یہ حصار، یہ بازار یہ ہُو حق کی صدائیں یہ سب میری ہی..... ان سب کا مجھ سے ہی علاقہ ہے۔''

مرد نے متانت کے ساتھ جواب دیا۔

لکھیا اینٹ کی اس سادہ عمارت میں کچھ سفید پوش سائے نظر آئے جن کے چہروں کے خطوط گہرے اندھیرے کی وجہ سے صاف نظر نہیں آرہے تھے۔

''وہ..... وہ کون لوگ ہیں؟'' ڈاکٹر نے بے صبری سے پوچھا۔

مرد نے ادب سے ان سایوں کو دیکھا اور تھوڑی دیر بعد بولا۔

''وہ عمارت اور سفید پوش ہُو حق کی صدائیں بلند کرنے والے سب اسی بستی کا حصہ ہیں۔ بازار کے تمام افراد بھی اسی بستی کا ایک حصہ ہیں۔ اس عمارت کے سارے مکین بھی اسی بستی کا ایک حصہ ہیں اور یہ سب کے سب اس مریضہ کی بیماری سے آدھے ادھورے رہ گئے ہیں۔''

''مطلب؟'' ڈاکٹر کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''سب اسی خاتون کے حوالے سے اپنی زندگی گزارتے تھے۔ شعوری طور سے کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ مریضہ ان کے لیے کتنی کارآمد ہے لیکن جب سے وہ بیمار ہوئی ہے، کمزور ہوئی ہے سب خود میں کچھ نہ کچھ کھو رہے ہیں۔''

''یہ باتیں تو پہیلیوں جیسی ہیں۔'' ڈاکٹر دھیمے سے بولا۔ اب اسے ڈر لگنے لگا تھا لیکن اب اس کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا تھا۔ جب سورج کی آخری

شعاع ماند ہو کر اندھیرے میں کھو گئی تو اس پھیلی ہوئی آبادی میں استادہ اس عظیم الشان عمارت کی وسیع و عریض چھت کے حصار کے پاس کھڑے ہو کر اس نے خود کو مرعوب پایا۔ لیکن اب اس سے رہا نہیں گیا۔

''روگی کون ہے آپ نے اب تک نہیں بتایا؟ آپ نے اب تک روگی سے اپنے رشتے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' چھت کی کھلی فضا میں ڈاکٹر نے ہمت پا کر سوال کیا۔

مرد حصار کے نیچے جھانکتا رہا۔ پھر یکایک بولا۔

''آپ خود کچھ نہیں سمجھ سکے؟'' مرد کی آنکھوں میں ایک دکھ بھرا سوال تھا۔

تب ڈاکٹر کو اچانک ایسا لگا جیسے پردہ سا ہٹ گیا ہو۔ اسے یاد آیا جب اس نے مریضہ کے دل کی دھڑکنیں سنی تھیں تو اسے کچھ آوازیں بھی سنائی دی تھیں جنھیں وہ اس سے پہلے بھی بارہا سن کر خوش ہو چکا تھا۔

اب اس نے بغور اس وجیہہ مرد کو دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

''شام ڈھل گئی ہے۔ آیئے نیچے چلیں۔ روگی کو دیکھ لیں۔''

وہ دونوں تیزی سے نیچے اترے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی انھیں محسوس ہوا کہ برابر والے کمرے سے ہوا کے تازہ جھونکے آرہے ہیں۔ مریضہ بستر پر گاؤ تکیے کے سہارے وقار کے ساتھ بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر سرخی جھلک آئی تھی۔ ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر اس نے کوئی تکلف نہیں کیا لیکن مرد کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شکر گزاری کے جذبے لہرائے۔

''کیسی ہو؟'' مرد نے کمال محبت کے ساتھ قریب جا کر دھیرے سے پوچھا۔

وہ بدقت مسکرائی۔ بڑی بڑی آنکھوں سے مرد کا جائزہ لیا اور ادب سے بولی۔

''اس وقت تو اچھی ہو جاتی ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ تمھارے اعضائے رئیسہ مکمل طور پر تندرست ہیں۔ بس سانس لینے بھر کو تازہ ہوا کی کمی ہے۔''

مریضہ خاموشی کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

''آپ اتنا پریشان کیوں ہوتے ہیں۔'' وہ دیر کے بعد بولی۔

''تم جانتی ہو کہ اس بستی کا کاروبارِ ہستی میری وجہ سے قائم ہے۔ تم نصیب دشمناں ختم ہو گئیں تو دھیرے دھیرے سب کچھ خس و خاشاک ہو جائے گا۔''

''کیا'' ڈاکٹر نے انھیں روک کر پوچھا۔ ''کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ برابر والے کمرے کی کھڑکی ہمیشہ کھلی رہے اور تازہ ہوا آتی رہے۔''

''برابر والے کمروں میں جہاں اور مکین ہیں وہیں کچھ نوجوان بھی ہیں۔ چاروں طرف بنے ان کمروں میں صرف ایک کمرہ ایسا ہے جس کے مکین نے باہر کی 'کھڑکی' کھول رکھی ہے۔ شام کو جب وہ واپس آتا ہے تو دروازہ کھول دیتا ہے۔ تبھی تازہ ہوا کے جھونکے اندر آپاتے ہیں۔ دن بھر روزی روٹی کے چکر میں مارا مارا پھرتا ہے۔ شام ڈھلے واپس آپاتا ہے۔''

باقی لوگ بھی اپنی رہائش گاہوں کی کھڑکیاں کھول کر ادھر والے دروازے نہیں کھول سکتے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''غالباً انھیں اب اس خاتون سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''اس نوجوان کو دلچسپی کیوں ہے؟''

''کیوں کہ وہ اس خاتون کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے۔''

''وہ کیوں۔''

''کیوں کہ اسے اپنے اجداد سے محبت ہے۔''

یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔'' ڈاکٹر نے بہت مایوسی کے عالم میں کہا۔

''میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ اگر میں کچھ بتانا بھی چاہوں تب بھی ضروری نہیں کہ ہر بات آپ کی سمجھ میں آسکے۔'' مرد نے رنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا میں کچھ کر سکتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے جیسے ہتھیار ڈال دیے ہوں۔

''آپ ڈاکٹر ہیں۔ آپ ہی بہتر بتا سکتے ہیں کہ آپ کیا کر سکتے ہیں؟''

تب ڈاکٹر نے بہت مضبوط لہجے میں لیکن ادب کے ساتھ کہا۔ میں صرف پھیپھڑوں کو مضبوط کرنے والی دوا دے سکتا ہوں لیکن پھیپھڑوں کی مضبوطی کی اصل دوا دراصل تازہ ہوا ہوتی ہے۔'' اس ماحول میں اتنی دیر تک رہنے کے بعد وہ اب صاف و شفاف زبان میں بات کر سکتا تھا۔ وہ پھر گویا ہوا۔

''اس عمارت کے تمام نوجوان مکینوں سے کہیے کہ وہ باہر کھلنے والی تمام کھڑکیاں کھول کر اس کمرے میں کھلنے والے دروازے کھول دیں۔''

''اگر وہ ایسا نہ کریں ... تب ... تب کیا ہوگا؟'' مریضہ نے بہت بے صبری کے ساتھ پوچھا۔

''تب'' ڈاکٹر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تب یہ ختم ہو جائیں گے۔'' اس نے دراز قد وجیہہ مرد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

حسین و جمیل مغموم مریضہ اور دراز قد وجیہہ مرد نے ایک دوسرے کو کن نگاہوں سے دیکھا، یہ کوئی نہیں دیکھ سکا کیوں کہ ڈاکٹر دھیرے سے بیگ اٹھا کر خاموشی سے باہر نکل آیا تھا۔

□□□

علی ظہیر

شہریار سے گفتگو

سوال: شہریار صاحب آپ نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ آپ خود کو دہراتے نہیں ہیں اور اپنے چاہنے والوں اور پڑھنے والوں کو مایوس کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اگر آپ کو کبھی ایسا محسوس ہو کہ آپ اپنے چاہنے والوں کی توقعات پوری کرنے کی کوشش میں خود اپنی توقعات پر پورے نہ اترے ہوں تو آپ کیا کریں گے؟ آپ اپنی پسند کو ترجیح دیں گے یا اپنے پڑھنے والوں کی؟

جواب: پہلے تو میں اپنی پسند ہی کو ترجیح دیتا ہوں۔ اپنی لکھی ہوئی تحریر کو غیر کی طرح پڑھتا ہوں جب تک میں یہ نہ جانوں کہ یہ کچھ نہ کچھ مختلف ہے، میں اسے قبول نہیں کرتا۔ اب اس عمل میں شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو میرے قاری ہیں۔ میں ابلاغ کا قائل ہوں اور میں یہ نہیں کہتا کہ میں صرف اپنے لیے لکھتا ہوں۔

سوال: آپ نے پہلے کہا تھا کہ آپ شعوری طور پر کسی شاعر سے متاثر نہیں ہیں۔ اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

جواب: غالب تو متاثر کرتے ہیں۔ دراصل غالب ہر شخص کو اس کی اپنی سطح پر متاثر کرتے ہیں۔ ن م راشد اور اختر الایمان میرے ماڈل رہے ہیں۔

سوال: آپ کے پسندیدہ شعراء غالب، فراق، فیض، مجید امجد، مختار صدیقی، ن م راشد، میراجی، اخترالایمان، منیر نیازی اور ناصر کاظمی رہے ہیں تو کیا ان کا پرتو آپ کی شاعری پر نہیں پڑا؟

جواب: اس میں اور بہت سے نام چھوٹ گئے ہیں۔ غضنفر نے مجھ پر ایک خاکہ لکھا تھا، میرے دوستوں میں انھوں نے کچھ نام چھوڑ دیے۔ اس پر بہت سے میرے دوست نالاں ہوئے۔ دراصل فہرست سازی کوئی ضروری نہیں ہے میں سب کو پڑھتا ہوں۔ تنقید بھی، افسانہ بھی اور شاعری بھی۔

سوال: آپ کی مختصر نظمیں بہت بااثر ہوتی ہیں۔ مجھے منیر نیازی کی مختصر نظمیں بھی بہت پاور فل لگتی ہیں۔ کیا آپ ان کی مختصر نظمیں پسند کرتے ہیں؟

جواب: ان کی بھی اور اختر الایمان کی چھوٹی چھوٹی نظمیں مجھے پسند ہیں۔ منیر نیازی کی نظموں میں اختر الایمان کا سا ارتکاز نہیں ہوتا۔ مختصر نظموں میں جب تک شدت تاثر نہ ہو بات نہیں پیدا ہوتی۔

سوال: ما بعد جدیدیت کی ادبی تھیوری تو یہ کہتی ہے کہ آپ کا اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی لفظ، کوئی نہ کوئی استعارہ، کوئی نہ کوئی ایکس پریشن آپ کہیں نہ کہیں سے اٹھا لیتے ہیں۔ اگر آپ کی نظموں اور غزلوں کو ڈی کنسٹرکٹ (ردِتشکیل) کیا جائے تو کیا ایسا ہی ہوگا؟

جواب: یہ میں نہیں بتا سکتا۔ جب تک میں ملازمت میں تھا تو تنقید کی کتابیں پابندی سے پڑھتا تھا لیکن وظیفہ لینے کے بعد میں نے اپنے اوپر سے یہ پابندی ہٹالی ہے۔ اب وہی پڑھتا ہوں جو مجھے اچھا لگتا ہے۔ تھیوری کی وہ باتیں جن میں مصنف یا شاعر کو بے دخل کر دیا گیا ہے میرے لیے ناقابل فہم ہیں۔ لیکن چونکہ تھیوری میں مختلف سماجی علوم داخل ہیں تو تجزیہ کرنے والا جب تک کئی علوم مثلاً نفسیات، عمرانیات، فلسفہ اور تاریخ وغیرہ پر کامل دسترس نہ رکھتا ہو، کسی فن پارے کا تجزیہ ٹھیک طریقے سے نہیں کر سکتا۔

سوال: آپ نے اکثر کہا ہے کہ خلیل الرحمن اعظمی نے آپ کو بگاڑا بھی ہے اور بنایا بھی۔ کیا آپ ہمیں یہ بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے آپ کو بگاڑا کس طرح اور بنایا کس طرح؟

جواب: دیکھیے۔ بگاڑنے والی بات تو میں نہیں جانتا۔ شاید یوں ہی کہہ دیا ہو لیکن جہاں تک بنانے کا سوال ہے تو آج میں چھوٹا موٹا جو بھی شاعر ہوں، اس میں ان کا بہت حصہ رہا ہے۔ شاعری کی طرف میرا رجحان انھی کی صحبت کا اثر ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہماری دوستی کی کوئی شعوری بنیاد نہیں تھی۔ لیکن ہم اس قدر گہرے دوست تھے کہ ان کا شاعری سے گہرا تعلق میرے تخلیقی سرچشموں تک پہنچ گیا۔

سوال: آپ کے تین دوست ایسے ہیں جن کے لیے آپ اپنی جان بھی دے سکتے ہیں اور کسی کی جان بھی لے سکتے ہیں۔ میری مراد مغنی تبسم، شمس الرحمن فاروقی اور گوپی چند نارنگ سے ہے۔ کیا یہ محض ایک اتفاق ہے کہ یہ تینوں حضرات اردو ادب کے مانے ہوئے نقاد بھی ہیں؟ ان کے علاوہ بھی کوئی اور دوست ہے جس کے لیے آپ ایسا ہی جذبہ رکھتے ہوں؟

جواب: دیکھیے گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی اور مغنی تبسم سے میری دوستی تیس چالیس سال پرانی ہے۔ اس وقت یہ لوگ اتنے مشہور نہیں تھے اور بحیثیت نقاد کے اسٹیبلش بھی نہیں تھے۔ اسے اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں۔ جی ہاں ان کے علاوہ بھی میرے بہت اچھے اور چاہنے والے دوست ہیں۔ مثلاً آپ مجتبیٰ حسین ہی کو لے لیجیے۔ مجتبیٰ حسین سے میری دوستی تیس سال پرانی ہے۔ مجتبیٰ حسین کے علاوہ بھی اور بہت سے دوست ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ فہرست سازی سے مشکل یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی دوست کا نام رہ گیا تو پھر غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

سوال: شہریار صاحب 1986 میں آپ کو آپ کے

مجموعۂ کلام "خواب کا در بند ہے" پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایسا کیوں ہے کہ ادب کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ جنوب کے لکھنے والوں تک نہیں پہنچتا؟

جواب: مجھے نہیں معلوم جنوب کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ شروع میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ادیب یا شاعر کی مجموعی خدمات پر ملتا تھا۔ اس وقت صرف بہت ہی سینیر لکھنے والوں کو یہ ایوارڈ دیا جاتا تھا۔ بعد میں یہ انعام کتابوں پر ملنے لگا۔ میرا یہ خیال ہے کسی ایوارڈ کے ملنے یا نہ ملنے سے اچھے فن کار کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اچھا لکھنے والا یا لکھنے والی اس سے بے نیاز ہوتا/ ہوتی ہے۔ اب دیکھیے گذشتہ میں پریم چند، عصمت چغتائی، مخدوم، جذبی اور سردار جعفری کو یہ ایوارڈ نہیں ملا۔ اس سے ان لکھنے والوں کی عظمت کم تو نہیں ہوتی۔

بعض اچھے لکھنے والوں جیسے قرۃ العین حیدر کو یہ ایوارڈ ملا۔ لیکن اس سے ان کی عظمت نہیں بڑھی وہ ہر حال میں اچھی ادیبہ کہلائیں گی اور پھر میرا خیال ہے کہ جہاں کہیں '' ہیومن ایجنسی'' ہوگی وہاں کچھ نہ کچھ اونچ نیچ تو ہوگی ہی۔

سوال: آپ نے حیدر آباد سے اپنے دیرینہ تعلق کا اکثر ذکر کیا ہے۔ آپ کے رسالے "شعروحکمت" کی وجہ سے اس شہر سے آپ کا ادبی تعلق تو مسلسل ہے ہی۔ اپنے بزرگ دوستوں میں آپ مخدوم صاحب کا نام تو لیتے ہیں لیکن سلیمان اریب کا تذکرہ نہیں کرتے۔ کیا آپ نے انہیں بھلا دیا ہے؟

جواب: بحیثیت شاعر، سلیمان اریب مجھے بہت پسند کرتے تھے۔ ''صبا'' میں انھوں نے میرا ایک گوشہ بھی شائع کیا تھا۔ علی گڑھ جب بھی آتے تو مجھے بلاتے تھے۔ لیکن ان سے کبھی میرا پرسنل تعلق نہیں رہا۔ 1968 سے میں حیدرآباد مسلسل آتا رہا ہوں، وہ بہت ہی خوش گوار اور کبھی نہ بھولنے والے دن ہیں۔ عوض سعید، شاذ تمکنت، مغنی تو جب بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ اب تو میں انھی کے لیے آتا ہوں۔

سوال: کیا آپ ہندستان او رپاکستان کے موجودہ لکھنے والوں میں کوئی مماثلت پاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے۔ فارم ٹریٹ منٹ، ڈکشن وغیرہ میں۔ کیا دونوں جانب ایک جیسا ہی ادب تخلیق ہورہا ہے؟

جواب: ملک کی تقسیم ہی غیر فطری رہی۔ ادب کی تقسیم بھی غیر فطری ہوگی۔ البتہ مختلف زمانوں میں مختلف علاقوں کا ادب میں رول رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں پنجاب کا رول ہے۔ اسے ہم ہندستانی یا پاکستانی نہیں کہہ سکتے۔

سوال: شمس الرحمن فاروقی صاحب نے آپ کے بارے میں کہا ہے کہ آپ ہمارے سب سے زیادہ داخل ہیں اور سب سے زیادہ دور کوش شاعر ہیں۔ یہ داخل بینی وغیرہ تو کشف و کرامات سے تعلق رکھتی ہے۔ کیا آپ اس میں یقین رکھتے ہیں؟ میرا مطلب ہے ایسا روحانی تجربہ جہاں آدمی وہ دیکھ اور دکھا سکے جو عام آدمی نہیں کرسکتا۔ کیا آپ کا ایسا کوئی روحانی تجربہ رہا ہے؟

جواب: ان کی اس سے کیا مراد ہے۔ یہ تو میں نہیں جانتا۔ ہوسکتا ہے وہ اپنے اندرون میں جو بھی ہوتا ہے۔ اتھل پتھل، اسے بیان کررہے ہوں۔ میرے خیال میں داخلیت اور خارجیت کے درمیان میں کوئی چیز ہے جیسے سفیدی اور سیاہی کے درمیان کئی رنگ آتے ہیں۔ میں تو اس درمیانی کیفیت کا قائل ہوں اور شاید میری شاعری میں بھی ایسا ہی کچھ ہے۔ جی نہیں۔ اس طرح کے کشف و کرامات سے میں بالکل کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

سوال: آپ کو نظم اور غزل میں ہم آہنگی کا راستہ اختیار کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کیا سابق میں فیض نے بھی یہی نہیں کیا تھا؟

جواب: فیض کے یہاں، ان کی غزلوں میں خاصا روایتی انداز رہا ہے۔ انھوں نے اردو کی کلاسیکل شاعری کی اصطلاحات وہی رکھی ہیں جیسے، ساقی، محتسب، زنداں، قفس، صبا وغیرہ اور انھوں نے انھیں غزل اور نظم دونوں میں استعمال کیا ہے۔ اسی لیے ان کی نظم میں غزل والی بات نظر آتی ہے۔ ویسے غزل کے ڈکشن میں جو تازگی ہے وہ مخدوم، مجروح اور فیض میں تقریباً یکساں ہے۔

سوال: سیاسی حالات کا اثر انسان کے ہر شعبۂ حیات پر پڑتا ہے۔ فنونِ لطیفہ بھی اس سے الگ نہیں۔ موجودہ عالمی سیاسی صورتِ حال اور ہمارے سارک ممالک کی نئی کاوشیں جن میں کشمیر کے مسائل بھی کچھ حل ہوتے ہوئے نظر آرہے ہیں، آپ کی نظر میں کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ کیا کہیں کوئی امید نظر آتی ہے؟

جواب: میں تو اصل میں شروع ہی سے اوپٹیمسٹ (Optimist) رہا ہوں۔ مثلاً 1947 کے بعد تقسیم کے وقت جو صورت حال تھی، وہ بہت مختلف تھی۔ اس وقت ایسا لگتا تھا کہ معلوم نہیں اس ملک میں مسلمان رہ بھی پائیں گے یا نہیں۔ آج بحیثیت ایک اقلیت کے ہندستان میں مسلمان موجود ہیں اور اپنی اپنی زندگیوں کے دائرے میں خاصی ترقی بھی کررہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک میں طاقت کا غلط استعمال ہوا ہے۔ یہ ہر جگہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دہشت گردی اختیار کی جائے۔ یہ رجحان کوئی منزل نہیں رکھتا۔ نفرت خوف کی پیداوار ہے۔ جس معاشرے میں خوف ہوگا وہاں نفرت ہوگی۔ میری نظر میں دہشت گردی واقعی بری چیز ہے۔ چاہے کسی کی طرف سے ہو۔ '' بنیاد پرست'' کی اصطلاح اور '' دہشت گرد'' کی اصطلاح عام طور سے صرف مسلمانوں کے لیے مختص کردی گئی ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ بعض مسلمان خود پر لگائے ہوئے الزامات صحیح ثابت بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لیجیے اردو جو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ دہشت گردوں کی زبان کہی جارہی ہے۔ بہرحال میں اس بات کا قائل ہوں کہ اگر ملک میں ترقی ہوگی تو مسلمانوں میں بھی ترقی ہوگی۔

(بشکریہ ''سیاست'' حیدرآباد، 16 فروری 2004)

("جامع اردو انسائیکلوپیڈیا" جلد-3 (سماجی علوم) سے اقتباس)

انسانی حقوق

ہر وقت بدلتے ہوئے سماجی معاشی اور سیاسی ڈھانچے کی وجہ سے کئی قسم کے ازم آئے اور چلے گئے۔ اس کے علاوہ بے شمار مذاہب آئے اور حیات انسانی کو خاصا متاثر کرتے رہے۔ لیکن فاشزم اور نازی ازم کے غلبے اور اس کے زوال کے بعد اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ کچھ بنیادی اصول اور نظریے وضع کیے جائیں تاکہ اقتدار کی باگ ڈور سنبھالنے والے اپنے رہنما ازم کی روشنی میں من پسند اختیارات نہ حاصل کرلیں اور عوام کے تمام جمہوری اور خصوصی اختیارات پامال نہ کردیں۔ ادارۂ اقوام متحدہ نے 1948 میں "بین الاقوامی اعلانیہ انسانی حقوق" (Universal Declaration of Human Rights) پیش کیا جس پر تمام ممبر ممالک نے دستخط کیے۔

انسانی حقوق کے نظریے کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو انسانی زندگی گزارنے کے لیے کچھ آزادی، کچھ وقار اور کچھ حقوق چاہیے ہیں۔ جن کی عدم موجودگی میں کوئی بھی انسان انسان کی طرح نہیں جی سکتا۔ یہ حقوق ہر انسان کو صرف انسان ہونے کی حیثیت سے ملتے ہیں۔ اقوام متحدہ کا ادارہ مسلسل ان کو اَپ ڈیٹ کرتا رہتا ہے۔ 1948 کے بعد 1966 میں انٹرنیشنل کنونشن آف سول پولیٹیکل سائنس کا اعلانیہ جاری کیا گیا۔ اس کے علاوہ اسی سال معاشی معاشرتی اور تمدنی حقوق کے سلسلے میں اعلانیہ پیش کیا گیا۔

اقوام متحدہ نے عوامی عالمی اطلاعاتی کمیشن برائے حقوق انسانی قائم کیا۔ ہندستان نے شروع سے ہی حقوق انسانی میں بے حد دلچسپی لی۔ یہ دلچسپی ملکی اور عالمی دونوں سطحوں پر تھی۔ بھارت اکثر و بیشتر ہونے والے کنونشنوں میں حصہ لیتا رہا اور مختلف فیصلوں پر دستخط کرتا رہا۔ نوے کی دہائی میں ہندستان نے اپنا انسانی حقوق کمیشن شروع کردیا جو ابتدا سے ہی بہت فعال رہا۔ ہندستان میں انسانی حقوق سیکشن 2 تحفظ حقوق انسانی ایکٹ 1993 میں پیش کیا گیا جس پر صدر ہندستان نے 8 رجنوری 1994 کو دستخط کردیے۔ ان حقوق کو زندگی، آزادی، مساوات، انسانی وقار اور سماجی انصاف سے متعلق شعبوں میں شامل کیا گیا ہے۔ اگرچہ حقوق انسانی پر کافی تحقیق ہوتی رہی ہے اور اس کے کئی پہلو زیر بحث رہے ہیں، اس کے باوجود بنیادی حقوق کو تقریباً 30 آرٹیکل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ 30 آرٹیکل مندرجۂ ذیل ہیں۔

(1) دنیا کے تمام انسانوں کو بنیادی طور پر یکساں حقوق حاصل ہونا چاہیے اور ان میں مساوات اور بھائی چارا ہونا چاہیے۔

(2) اقوام متحدہ کے اعلانیہ میں درج ہر قسم کی آزادی، نسل، رنگ، جنس، مادری زبان، مذہب، سیاسی نظریات، جائے پیدائش، مالی حیثیت اور خاندان کو مدِ نظر رکھے بغیر یکساں طور پر ہر فرد کو حاصل ہونی چاہیے۔ کم حیثیت اور طاقت اور افراد اور ممالک کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جانا چاہیے۔

(3) ہر فرد کو زندگی، آزادی اور ان دونوں کے تحفظ کا پورا حق ہونا چاہیے۔

(4) غلامی اور غلاموں کی تجارت کسی قیمت پر منظور نہیں کی جانی چاہیے۔

(5) کسی بھی انسان کو ایذا، ظلم اور غیر انسانی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

(6) ہر فرد کو ایک انسانی پہچان دی جائے گی جس کا مطلب ہے کہ اس کا نام اور انفرادی پہچان ہوگی۔

(7) قانون کے سامنے ہر فرد برابر ہوگا۔ کسی قسم کا ترجیحی سلوک حقوقِ انسانی کی سخت خلاف ورزی ہوگا۔

(8) ہر فرد حقوقِ انسانی اور بنیادی حقوق دونوں کے استحصال کے خلاف ملک کی اعلاترین عدالت میں جاسکتا ہے۔

(9) بغیر کسی وجہ کے کسی کو نہ قید کیا جائے گا نہ نظر بند، اور نہ جلاوطن ہی کیا جائے گا۔

(10) ہر قسم کی حراست میں بند ہر انسان کو صاف ستھری مساوات پر مبنی اور غیر جانبدار عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

(11) (الف) ہر ملزم معصوم تصور کیا جائے گا جب تک کہ جرم ثابت نہ ہو۔
(ب) جرم ہونے کے بعد لاگو ہونے والے قانون کے تحت کوئی بھی فرد سزا نہیں پائے گا۔

(12) کسی کی ذاتی زندگی، خاندانی تعلقات، خط و کتابت اور دیگر پرائیویٹ معاملات میں کوئی قانون مداخلت نہیں کرے گا۔

(13) اپنی ریاستی حدوں میں کہیں بھی رہنے یا سفر کرنے کا حق ہر کسی کو حاصل ہوگا۔

(14) (الف) دوسرے ممالک میں پناہ اور تحفظ حاصل کرنے کا بھی ہر شخص کو حق ہوگا۔
(کچھ ممالک پناہ گیروں کو خاص طور پر آسرا دیتے ہیں۔ انھوں نے ایک خاص کنونشن پر دستخط کیے ہوئے ہیں۔)
(ب) اس حق کا اطلاق غیر سیاسی جرائم اور اقوامِ متحدہ کے اصول کے برعکس حرکت کرنے والے افراد پر نہیں ہوگا۔

(15) ہر فرد کو شہریت کا حق حاصل ہوگا۔ نہ کسی کی شہریت زبردستی غصب کی جائے گی اور نہ ہی نیشنلٹی (Nationality) تبدیل کرنے سے روکا جائے گا۔

(16) ہر عاقل اور بالغ مرد اور عورت کو شادی کا حق حاصل ہوگا۔ ہر شخص

شادی کرکے خاندان کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔ شادی کے بندھن میں بندھنے اور ٹوٹنے دونوں صورتوں میں عورتوں کے تحفظ کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ ہر خاندان کو سماج کی اکائی سمجھا جائے گا اور اسے قانون کی طرف سے پورا تحفظ حاصل ہوگا۔

(17) ہر فرد شرکت میں یا ذاتی طور پر جائیداد خرید سکتا ہے۔ کسی کو اس کی جائیداد سے جس کا وہ قانونی طور پر مالک ہے، بلاوجہ محروم نہیں کیا جائے گا۔

(18) ہر فرد کو اپنے اصول اور نظریے، اپنے ضمیر اور مذہب کی روشنی میں رکھنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اس کا اظہار کرنے کا بھی پورا موقع اسے میسر ہونا چاہیے۔

(19) ہر فرد کو آزادیِ رائے اور اظہارِ خیال کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔

(20) ہر فرد کو پر امن طور پر ملنے، انجمن بنانے اور مظاہرہ کرنے کا حق ہونا چاہیے لیکن کسی کو کسی انجمن کا ممبر بننے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

(21) (الف) اپنے ملک میں ہونے والے سیاسی واقعات اور سرکار کے انتخاب میں حصہ لینے کا ہر ایک کو اختیار ہے۔

(ب) اپنی حکومت کے تحت چلنے والی سیواؤں پر ہر ایک کا برابر حق ہے۔

(ج) جمہوری طرز کے صحیح اور صاف ستھرے انتخابات ہونا بھی ہر فرد کا حق ہے اور ان میں حصہ لینا بھی بنیادی انسانی حق ہے۔ چندہ نمائندوں والی سرکار ہی اصلی سرکار سمجھی جانی چاہیے۔

(22) ہر فرد کو سماجی تحفظ (Social Security) کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

(23) ہر فرد کو کام کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ بے روزگاری سے تحفظ بھی اس میں شامل ہے۔ ہر فرد کو اپنے کام کرنے کے سلسلے میں ٹریڈ یونین کا ممبر ہونے، ٹریڈ یونین قائم کرنے اور اس میں حصہ لینے کا پورا حق ہونا چاہیے۔

(24) ہر فرد کو کام کے ساتھ آرام اور تفریح کا بھی پورا حق حاصل ہونا چاہیے اس میں کام کے گھنٹوں اور چھٹیوں کا معاملہ بھی شامل ہے۔

(25) ہر فرد کو ایک خوش حال معیارِ زندگی کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ اس میں روٹی، کپڑا، مکان، دوا اور سماجی تحفظ شامل ہے۔ اس کے علاوہ زچگی اور حمل کے دوران خصوصی دیکھ بھال اور بچے کی صحیح پرورش کا پورا حق ہر عورت اور بچے کو حاصل ہونا چاہیے۔ چاہے بچہ شادی شدہ تعلقات سے پیدا ہوا ہو یا شادی کے بغیر۔

(26) ہر فرد کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ بنیادی تعلیم فراہم کرنا جمہوری حکومت کا فرض ہے۔ تعلیم اقوام متحدہ کے نظریے کے برعکس نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود والدین کو حق حاصل ہے کہ اپنی پسند کی تعلیم اولاد کو دیں۔

(27) ہر فرد کو اپنی تمدنی زندگی گزارنے کا اور سائنسی ایجادات سے ہونے والے فوائد حاصل کرنے کا پورا حق ہونا چاہیے۔ اپنی ایجادات اور دریافتوں سے ہونے والے معاشی اور اخلاقی فوائد کے تحفظ کا اختیار بھی اس میں شامل ہے۔

(28) مقامی اور عالمی سطح پر دی جانے والی آزادی پر بھی حق ہونا چاہیے تاکہ ان تمام حقوق پر عمل ممکن بنایا جاسکے۔

(29) تمام عالمِ انسانی کے لیے ہر فرد کے مختلف سطح پر فرائض بھی ہیں جو دوسروں کی حقوقِ انسانی کے تحفظ کی گارنٹی دیتے ہیں۔ اس طرح انسانی حقوق پر مبنی معاشرہ عالم وجود میں آتا ہے۔ جو کہ دراصل ہر فرد کو اس کی شخصیت کی ترقی کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اس طرح ہر فرد فرائض اور حقوق کے ذریعے فلاحِ انسانی کے ایک خاص معیار کو حاصل کرسکتا ہے۔

(30) ان حقوقِ انسانی کی اس طرح تاویل نہ کی جائے کہ امن، آشتی، آزادی اور دوسروں کے حقوق کا استحصال ہونے لگے۔ دوسرے الفاظ میں اپنی کلچرل آزادی دوسروں کے لیے دہشت گردی نہ بن جائے۔

وقت کے ساتھ ساتھ یو.این.او نے مختلف کمیشن اور سب کمیشن قائم کیے۔ حقوقِ نسواں، حقوقِ اطفال کے ساتھ اقلیتوں کے حقوق، ہم جنسوں کے حقوق، پناہ گیروں اور مہاجروں کے حقوق وغیرہ کے اصول مرتب کیے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں مذہب اور معاشرے کے حقوق وغیرہ کے اصول مرتب کیے۔ تیسری دنیا میں مذہب اور معاشرے کی سرحدیں اکثر حقوقِ انسانی کے آڑے آتی ہیں۔ ہندستان میں حقوقِ انسانی پر بہت کام ہوا ہے لیکن اس کے باوجود سماجی طور پر ابھی بہت کام باقی ہے۔ تیسری دنیا کے حوالے سے ترقی کرنے کا حق اور ماحولیاتی آلودگی روکنے کا حق بہت معنی خیز ہیں۔

یو.این.ڈی.پی. کی طرف سے شائع ہونے والی سالانہ رپورٹ یعنی انسانی ترقی کی رپورٹ 2000 میں کہا گیا ہے کہ ایچ.ڈی.آئی. یعنی پیمانہ ترقی انسانی میں درحقیقت تین چیزیں شامل ہیں۔

(1) وقتِ پیدائش طویل زندگی کے امکانات: مثلاً محفوظ حمل، زچگی، معالجاتی سہولیات، دوا اور غذا کا حصول وغیرہ۔

(2) تعلیمی ترقی: یعنی بچوں کا رجسٹریشن پرائمری اور ثانوی اسکولوں میں، تعلیم بالغان وغیرہ کے علاوہ اسکولوں اور ٹیچروں کی موجودگی پڑھانے کے لیے دلچسپی اور ذمے داری۔

(3) اس کے علاوہ گھریلو پیداوار (G.D.P.) اور قوتِ خرید (P.P.P.) کا ایک خاص معیار۔

اس طرح یہ سہ رخی پیمانہ ترقیِ انسانی، حقوقِ انسانی کی صورتِ حال کو بھی کسی معاشرے میں عیاں کرسکتا ہے کیونکہ انسانی حقوق کے تحفظ کے بغیر انسانی ترقی ممکن نہیں ہے۔

□□□

سلامت اللہ

("تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر" سے اقتباس)

خاندان اور تعلیم

سماج کا بنیادی اور ابتدائی گروہ، خاندان کی شکل میں نمودار ہوا۔ خاندان میں شخصیت کی حیاتیاتی، نفسیاتی اور سماجی بنیادیں پڑتی ہیں۔ شخصیت کی تعمیر میں خاندان کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس کی تصدیق، نفسیات، عمرانیات اور بعض دیگر علوم کی متعدد تحقیقات سے ہوتی ہے۔ شکاگو میں ایف. این فری مین نے اس میدان میں جو مطالعہ کیا تھا اور جس کی تصدیق، آئیوا چائلڈ ویلفیر ریسرچ اسٹیشن کی شائع کردہ تحقیقات سے ہوتی ہے، اُس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گود لیے بچوں کی ذہانت اپنے اصل والدین کے مقابلے میں گود لینے والے والدین سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ذہانت کے معاملے میں وراثت کا اتنا دخل نہیں ہوتا جتنا خاندانی یا سماجی ماحول[1] کا ہوتا ہے۔

خاندان میں اطوار اور رویّوں کی ابتدائی تہذیبی شکلیں پشت در پشت منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ بینیڈکٹ کے قول کے مطابق "بچہ خود اپنے کلچر کی ایک چھوٹی سی مخلوق ہے" لیکن یہ 'در اصل' اُس کے خاندان کا کلچر ہے، جس میں وہ ڈھلتا ہے۔ "پیدائش کے وقت سے ہی اُس کے تجربے اور رویّے کی تشکیل وہ رسم و رواج کرتے ہیں، جن میں وہ پیدا ہوا ہے[2]" بچے کے تہذیبی پس منظر پر، غیر شعوری طور سے، خاندان ہی کی چھاپ ہوتی ہے۔ بچہ وہی زبان بولتا ہے، جو خاندان میں بولی جاتی ہے۔ اُسی قسم کی غذا استعمال کرتا ہے، جو خاندان میں پسند کی جاتی ہے۔ صنفی تعلقات میں وہ خاندانی روایات اور رسم و رواج کی پابندی کرتا ہے۔ اس کا ذاتی کلچر خاندانی سانچے میں ڈھلتا ہے۔ تاہم اس کی سیرت کے میلانات اور اطوار و خصائل کوئی ایسا تیار شدہ مال نہیں کہ جو خاندان اُسے گھڑی گھڑائی شکل میں عطا کردے۔ البتہ خاندان ایک ایسا ماحول مہیا کرتا ہے، جہاں آدمی کی زندگی کے ابتدائی سالوں میں اُس کی شخصیت کے نقوش اُبھرتے ہیں۔

ہندستانی خاندان کا ڈھانچہ: بڑی حد تک یہ سچ ہے کہ دوسرے روایتی سماجوں کی طرح، ہندستانی سماج بھی مشترکہ خاندانی نظام کا ایک نمونہ ہے۔ جب مشینوں کی مدد کے بغیر، زمانے کے رواج کے مطابق کھیتی باڑی کی جاتی تھی اور یہی لوگوں کی زندگی کا بڑا سہارا تھی تو اس پس منظر میں مشترکہ خاندان کا وجود بالکل ناگزیر تھا۔ لیکن ہندستان میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ اب یہ میلان پایا جاتا ہے کہ مشترکہ خاندان کو بدل کر ایک ایسے غیر مشترک خاندان کی تشکیل کی جائے جو فقط شوہر، بیوی اور اُن کی اولاد پر مشتمل ہو۔ ہندستانی گھرانوں کی بڑی تعداد، چھوٹی اور درمیانی جسامت کے خاندانوں پر مشتمل ہے، جن میں کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ چھ افراد ہوتے ہیں[3]۔ اس کی وجہ سے خاندان اس قابل ہے کہ اپنے تعلیمی رَول کو خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرسکے کیونکہ اب والدین اور ان کی اولاد، بڑی آسانی کے ساتھ ایک دوسرے سے ربط قائم رکھ سکتے ہیں اور نتیجے کے طور پر بچوں کے لیے، لسانی ترقی اور سیکھنے کے زیادہ مواقع نکل سکتے ہیں[4]۔ مشترکہ خاندان میں یہ بات ممکن نہیں اس لیے کہ اس صورت میں، والدین اپنے بچوں کی طرف خاص توجہ نہیں دے سکتے۔

عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ ہندستانی خاندان کے ہاتھ سے اس کے تاریخی فرائضِ منصبی نکلتے جارہے ہیں۔ صحت، معاش، تعلیم، مذہب، تفریح اور تحفظ سے متعلق، سب ضرورتیں جواب تک خاندان پوری کیا کرتا تھا، صنعتی ترقی کی وجہ سے اب گھر کے اندر پوری نہیں ہوسکتیں۔ ان میں سے متعدد فرائض کو حکومت اور کمیونٹی نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ لہٰذا والدین کا بچوں پر نہ وہ اثر باقی رہا اور نہ اختیار، جو انھیں اس سماج میں حاصل تھا جس میں جدید صنعت کا عمل دخل نہ تھا۔ کبھی والدین اور بچوں کے درمیان ٹکراؤ بھی ہوجاتا ہے۔ والدین کی کوشش ہوتی ہے کہ بچے مقررہ مراسم کی پابندی کریں، جب کہ بچے پرانے آداب اور فرسودہ رسوم کے خلاف بغاوت کرکے نئے طور طریق کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس کے باوجود، صرف خاندان ہی ایسا محفوظ ماحول پیش کرسکتا ہے جو کسی فرد کی جذباتی بہبود کے لیے سازگار ہو۔ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تین اہم کام باقی ہیں۔ یعنی محبت و شفقت کا سلوک، بچوں کی پرورش اور افرادِ خاندان کی غیر رسمی تعلیم۔

شخصیت پر خاندان کا اثر: فرائڈ اور ایڈلر نے، شخصیت بنانے میں بچپن کے تجربات کو بہت اہمیت دی ہے۔ بچے کے رول کو سمجھنے سمجھانے میں ان دونوں کا بڑا حصّہ ہے۔ بچہ اپنے بڑوں کی نقل کرتا ہے، بے سمجھے بوجھے نہیں بلکہ جان بوجھ کر۔ لڑکا اپنے باپ جیسا بننا چاہتا ہے اور لڑکی ماں جیسی۔ کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ شخصیت کی وضع قطع، بچپن کے باہمی اثرات سے متعین ہوتی ہے لیکن کسی حالت میں بھی اسے کسی خاص نمونے کا ہو بہو چربہ نہیں کہا جاسکتا۔ شخصیت افرادِ خاندان کے عمل اور ردِعمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک فرد کی شخصیت اس کے والدین یا قریب ترین بھائی بہن کی شخصیت کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ جن اشخاص میں باہمی تعامل ہوتا ہے، وہ ایک دوسرے کے ساتھ توقعات کے مطابق پیش آتے ہیں۔ ہر شخص کا رویّہ بحیثیت میزبان کچھ ہوتا ہے اور بحیثیت مہمان کچھ۔ خاندان کے مختلف اراکین کے جو باہمی رول ہوتے ہیں وہ ان کی شخصیت کی نشوونما میں بڑی

اہمیت کے حامل ہیں۔

بچے کی دیکھ بھال اور شخصیت کا فروغ: بچے کو اپنی زندگی کے پہلے سال کے دوران جن تجربات سے واسطہ پڑتا ہے اُن کے تاثرات عمر بھر باقی رہتے ہیں۔ لیکن اُس کے اگلے پانچ سالوں کے تجربات، حددرجہ اہم اور کہیں زیادہ دیرپا نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔

بچہ طفولیت کے دوران اپنی ذات کو خاندانی حلقے کے ساتھ وابستہ کرلیتا ہے، کیونکہ یہی حلقہ اس کی بنیادی ضروریات پوری کرتا ہے اور اسی حلقے میں رہ کر، اُس کی بنیادی عادتیں، اطوار اور خیالات نشوونما پاتے ہیں— بچے کی شخصیت کس نوعیت کی ہے اور اس میں کتنی وحدت ہے، اس کا دارومدار اُس جذباتی لگاؤ پر ہے جو بچے کو اپنی ماں سے ہوتا ہے۔ جن بچوں کو اچھی طرح دودھ نہیں پلایا جاتا، وہ شاذونادر ہی گہرا اور حسبِ معمول سانس لیتے ہیں۔ جن بچوں کو کافی گود میں نہیں لیا جاتا۔ خاص کر وہ بچے جنھیں بوتل سے دودھ پلایا جاتا ہے، اکثر ریاحی بیماریوں اور آنتوں کے عارضوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ پیدائش کے وقت بچے میں یہ حس بہت تیز ہوتی ہے کہ اس کا جسم کس حالت میں رکھا گیا ہے۔ بچے کو اگر یکایک اوپر اٹھالیا جائے یا تیزی یا زور شور سے اِدھر اُدھر ہلایا جائے تو بچے پر اُس کا فوری ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ وہ چونک پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے طرز کے جھولے اور ہنڈولے کی اتنی قدر کی جاتی ہے۔ جو مائیں اپنے بچوں کو گود میں ہلا ہلا کر میٹھی میٹھی لوریاں اور ننھے منھے گیت سناتی ہیں، ان سے بچے سے ایسی ماؤں کا تعلق خاطر، ان ماؤں کے مقابلے میں کہیں بہتر ہوتا ہے، جو ایسا نہیں کرتیں۔ لہٰذا اعصابی ہم آہنگی کے لیے اور دماغی نشوونما کی خاطر بہت ضروری ہے کہ بچے کو، بالخصوص نشوونما کی ابتدائی منزل پر ماں کا کافی پیار حاصل ہو۔

اگر ماں، کسی وقت بچے کی طرف سے لاپرواہی برتتی ہے، تو اس پر بچہ دو طرح سے احتجاج کرتا ہے۔ یا تو وہ دودھ نہیں پیے گا اور واویلا کرتا رہے گا۔ یہ منفی انداز کا احتجاج ہے۔ یا پھر وہ چپ چاپ ماں کے پستان یا دودھ کی بوتل سے منہ لگا کر ایسا بن جائے گا گویا سورہا ہے۔ یہ بچے کا رجعی سکون کہلاتا ہے۔ بہرکیف، یہ دونوں صورتیں حیاتیاتی اور نفسیاتی خلل کا باعث بن جاتی ہیں۔

بچہ جب تین مہینے کا ہوجائے، تو ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر وقت ماں سے چپٹا رہے لیکن اگر بچہ یہ سمجھے کہ اس کی ماں اپنی من مانی کرتی ہے اور اُسے اکیلا چھوڑ کر کام دھندے میں لگ جاتی ہے، تو اندیشہ ہے کہ کہیں بچے کا دماغ کسی شدید اُلجھن کا شکار نہ ہوجائے۔ اس مرحلے کے دوران سب سے زیادہ نمایاں ردِعمل، بچے کی وہ چیخ پکار ہے، جو وہ غصے کے اظہار کے لیے کیا کرتا ہے۔ اس چیخ پکار کو اُس رونے دھونے کی طرح نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، جو بچہ بالکل ابتدائی عمر میں کیا کرتا ہے۔ جب تک بچے میں کافی حد تک عزتِ نفس کا احساس بیدار نہ ہو اور جذباتی پختگی حاصل نہ ہوجائے، اس کے معمولات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ بچے کی دیکھ بھال کے سلسلے میں، بچوں کے طبیب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عمر کے پہلے سال کے دوران، بچے کو جذباتی گرم جوشی اور جذباتی تسکین کی ضرورت ہے، نیز حسبِ معمول نشوونما کے لیے اس کی جسمانی ضروریات کی طرف پوری پوری توجہ کرنی چاہیے۔

شخصیت کی ہم آہنگ نشوونما کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ بچہ محسوس کرے کہ وہ صورتِ حال سے نمٹنے کی اہلیت رکھتا ہے اور اس کی سلامتی کی پوری ضمانت موجود ہے۔ اگر بچے کو اُن کاموں کے کرنے سے روکا جائے، جو وہ بخوبی انجام دے سکتا ہے، تو اُس کی شخصیت میں نقائص پیدا ہوجانے کا امکان ہے۔ محبت کے رشتوں میں سلامتی کا احساس خاص طور پر ضروری ہے یعنی بچہ محسوس کرے کہ ماں باپ، بہن بھائی وغیرہ سے جو رشتہ قائم ہے، وہ ٹوٹنے والا نہیں ہے۔ بچے کی جانب ماں یا باپ کے طرزِ عمل میں، ردّ و قبول، پسندیدگی و ناپسندیدگی، رعب اور تسلیم و رضا، ہمدردی اور دُرشتی کا ایک گونہ امتزاج ہوتا ہے، یعنی ماں باپ کبھی بچے کی بات کو مان لیتے ہیں، کبھی نہیں مانتے، کبھی اس کے رونے کو پسند کرتے ہیں کبھی ناپسند کرتے ہیں، کبھی رعب سے کام لیتے ہیں کبھی اس کے مطالبات کے سامنے، سپر ڈال دیتے ہیں، کبھی اُس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور کبھی سختی دکھاتے ہیں، غرضیکہ والدین کے طرزِعمل میں یہ تمام چیزیں ملی جلی ہوتی ہیں۔ اگر یہ امتزاج معقولیت پر مبنی نہ ہو تو بچے کی شخصیت کے بگڑنے کا اندیشہ ہے۔

بچے کی جانب والدین کا طرزِ عمل: بچے کی اٹھان کیسی ہوگی اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس کی سرگرمیوں کی طرف والدین کا طرزِعمل کیا ہے۔ تکلفات اور شان و شوکت کے گرویدہ گھرانوں میں بچوں کو خاص طور پر تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ ہاتھ کے کام اور کھیل کود میں، جسم اور لباس کو مٹی اور گردوغبار سے آلودہ نہ کریں۔ اس قسم کی پابندیوں پر ٹیگور نے ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

”جو بچہ شاہانہ کپڑوں میں ملبوس ہوتا ہے اور جس کی گردن میں جواہرات کی زنجیر لٹکی رہتی ہے، اُسے کھیل میں لطف نہیں آتا، کیوں کہ اس کے کپڑے کھیل میں ہر وقت مخل ہوتے رہتے ہیں۔ اس خوف سے کہ کہیں اس کا لباس پھٹ نہ جائے یا میلا نہ ہوجائے وہ دنیا سے الگ تھلگ رہتا ہے اور نقل وحرکت سے ڈرتا ہے۔“(5)

والدین کی مداخلت بچے کو نئے روابط قائم کرنے اور ان سے لطف اندوز ہونے میں مانع آتی ہے۔ ان محرومیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ مختلف قسم کی غیر سماجی سرگرمیوں میں پڑ جاتا ہے۔ مثلاً ایسے مقامات پر آنے جانے لگتا ہے جہاں جانا مناسب نہیں، دوسروں کے صندوق کھولتا ہے، تالے توڑتا ہے، پبلک جائداد یا سامان کو نقصان پہنچاتا ہے، وغیرہ۔ جب بچہ نشوونما کی اُس منزل پر پہنچتا ہے جہاں اس میں چلت پھرت اور تلاش وجستجو کا رجحان پیدا ہوتا

ہے، تو ضرورت سے زیادہ محتاط ماں، اُس کو اُن مواقع سے محروم رکھتی ہے، جن کے ذریعے وہ اپنی نئی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ ہر نئے مرحلے پر بچے کے تجربے کا انحصار ایک حد تک اس امر پر ہوتا ہے کہ اس کے قریبی رشتے دار اس نئے تجربے کا کیا مطلب لیتے ہیں، کس حد تک اسے قبول کرتے اور کس درجہ اس کی قدر و منزلت کرتے ہیں۔

بچوں میں، ماحول سے عدم مطابقت کے مسائل پیدا کر دینے والے والدین چار قسم کے ہوتے ہیں، (1) وہ جو حد سے زیادہ لاڈ پیار کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سختی سے بچوں کو قابو میں رکھنا چاہتے ہیں، (2) وہ جو ضرورت سے زیادہ پیار کرتے ہیں، لیکن بہت کم کنٹرول رکھتے ہیں، (3) وہ جو پیار تو کم کرتے ہیں مگر کنٹرول زیادہ رکھتے ہیں اور (4) وہ جو پیار اور کنٹرول دونوں سے بے نیازی برتتے ہیں— لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ پیار اور کنٹرول میں توازن برقرار رکھا جائے اور یہ صرف بچے کی انفرادی خصوصیات کو نظر میں رکھ کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ایک بچہ ایسا ہوتا ہے، جس پر کتنا ہی اور کسی قسم کا کنٹرول عائد کیجیے، وہ اُس سے کوئی اثر نہیں لے گا۔ دوسرے بچے کی ترقی، شدید اور غلط قسم کی ڈسپلن سے رُک جاتی ہے۔

جن والدین، خاص کر ماؤں کے نوخیز لڑکے لڑکیوں کے درمیان گہرے اور معتبر تعلقات ہوتے ہیں، اُن کے مابین اعلا درجے کی مطابقت پائی جاتی ہے۔ خود والدین کے درمیان، زن و شوہر کے تعلقات اگر خراب ہیں یا والدین ڈسپلن کے معاملے میں شدت برتتے ہیں، تو اولاد کے ساتھ ان کے تعلقات میں یگانگت پیدا نہ ہوگی۔ سائنٹسٹ نے دو قسم کے گھرانوں کے بچوں کی شخصیت کے اختلافات معلوم کرنے کی غرض سے ایک مطالعہ کیا۔ کچھ بچے ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، جہاں والدین کا رعب غالب رہتا تھا، اور کچھ بچے ایسے گھرانے کے تھے جہاں والدین اپنی اولاد کے مطالبات، بے چون و چرا مان لیا کرتے تھے۔ مطالعے کے نتیجے میں، پہلے گھرانے کے بچے، موخرالذکر کے مقابلے میں زیادہ فرمانبردار، زیادہ شائستہ لیکن خود اعتمادی کے معاملے میں کم تر پائے گئے۔ تاہم ان میں ذمے داری کا احساس مقابلتاً زیادہ تھا۔(6)

بہر کیف، والدین اور اولاد کے مابین، کنٹرول اور محبت کے یہ مخلوط رشتے تصویر کا صرف ایک رخ ہیں۔ والدین، بچے کے لیے جو ماحول تیار کرتے ہیں اور ان کی سرگرمیوں سے زندگی کا جو نمونہ اُبھرتا ہے، وہ بچے کی شخصیت کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر جاتا ہے۔

بچے کی شخصیت کے فروغ میں رکاوٹ پڑنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین اس کی ذاتی خصوصیات کا بالکل غلط اندازہ لگاتے ہیں۔ ہر خاندان چاہتا ہے کہ اُس کا گھرانہ سب سے زیادہ مثالی گھرانہ بن جائے۔ اس قسم کی روش سے خاندان میں نااتفاقی، باہمی رنجش، اور مسلسل ملامت کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ والدین خیال کرتے ہیں کہ دوسرے خاندان کے بچوں کے مقابلے میں ان کا بچہ کم شائستہ اور زیادہ خود غرض واقع ہوا ہے۔ یہ خوف بھی دامن گیر رہتا ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں اُن کا بچہ کمتر ہے۔ اس خدشے کی وجہ سے بچے کو غیر ضروری ڈسپلن کے شکنجے میں کسا جاتا ہے۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ کسی گھرانے میں اگر بچوں کی جسمانی یا ذہنی نشوونما میں نمایاں فرق ہو یا کوئی اور تغیر پایا جائے، تو اس اختلاف کو یا تو سرے سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے، یا اسے غلط معنی پہنا دیے جاتے ہیں۔ ایک عام بات ہے کہ اگر ایک ہی ماں باپ کے دو بچوں کے رویوں میں اختلاف ہو، تو اُس پر انتہائی حیرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس بات کو بھلا دیا جاتا ہے کہ پہلے بچے کی پیدائش کے وقت خاندان کی جو خصوصیات تھیں، دوسرے بچے کی پیدائش کے وقت ان میں کافی فرق پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔

ایک ہی خاندان میں اولاد کے ساتھ جو امتیازی سلوک برتا جاتا ہے، اُس کے نتائج، نازک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ والدین کے مطالبات لڑکوں سے کچھ اور لڑکیوں سے کچھ اور ہوتے ہیں۔ اولاد بھی ان مطالبات کو یکساں سنجیدگی کے ساتھ قبول نہیں کرتی۔ بعض بچے اُن پر زیادہ دھیان دیتے ہیں اور بعض کم۔ والدین کے مطالبات کا یہ فرق اور بچوں کے طرز عمل کے اختلافات، ہر بچے کی مجموعی شخصیت کی تعمیر میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ تعمیرِ شخصیت میں دوسری اہم چیز وہ جذباتی انجماد ہے، جو والدین کے تعلق سے فروغ پاتا ہے اور صنف مخالف کے دوسرے افراد تک منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں، بچوں کی شخصیت کی نشوونما میں برابر کی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس عدم مطابقت کے ماحول میں، بچوں کے درمیان حریفانہ رجحان پرورش پاتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ ماں کی فکرمندی، باپ کی غفلت شعاری، والدین کی باہمی نااتفاقیاں اور بے اصولی ڈسپلن، یہ ہیں وہ اسباب جو بچے کی شخصیت کی تشکیل پر برا اثر ڈالتے ہیں۔

والدین کی آرزومندیاں اور بچے میں شعور ذات کا نشوونما: بچے کو خودی کا تجربہ دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک تو اُس وقت جب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی انفرادیت کے بارے میں دوسرے لوگوں کا ردِ عمل کیا ہے۔ دوسرے جب وہ جان لیتا ہے کہ اُس کے والدین اس سے کیا توقعات رکھتے ہیں۔ میک فارلین نے بچے کے مطابقت پذیر انداز کے سماجی پہلوؤں پر اجمالاً روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چھوٹے بچے کی شخصیت کا انحصار اس کے باپ کی مرضی اور توقعات پر ہے، اگر باپ فٹ بال کا ہیرو ہے، تو اُس کی خواہش ہوگی کہ اس کا بیٹا بھی فٹ بال کا ہیرو بن جائے اور اگر باپ کسی کالج کا پروفیسر ہے، تو وہ چاہے گا کہ اس کا بیٹا بھی اسی روایت کی پیروی کرے۔ ظاہر ہے کہ چھوٹا بچہ، باپ کی توقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس طرح اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔

والدین کے باہمی تعلقات کا بچے پر اثر: بچے کے احساس سلامتی پر،

ماں باپ کے باہمی تعلقات کا زبردست اثر پڑتا ہے۔ ان میں مکمل یک جہتی اور باہمی جھگڑے دونوں ہی بچے کے لیے نقصان رساں ہیں۔ والدین کی شخصیتوں میں قابل لحاظ ہم رنگی، ذوق وشوق اور دلچسپیوں میں اشتراک، ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا سلوک، باہمی التفات ومحبت اور اولاد برائے اولاد کی دلی تمنا، ایسی مثالی شرائط ہیں جو بچے کی صحت مند نشوونما کے لیے ضروری ہیں۔ اگر خاندان کے ماحول میں یہ شرائط نہ پائی جائیں، تو ظاہر ہے کہ والدین کے باہمی جھگڑے اور ان کے طرزعمل کے اختلافات بچوں کے لیے مسائل کھڑے کردیں گے۔ باپ ایک بات کہے گا، ماں دوسری بات، ایسی صورت میں بچوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ کس کی بات مانیں، اور کس کی نہ مانیں، اور وہ بیچارے اسی کشمکش میں مبتلا رہیں گے۔

گھر اور سماج کے مابین نزاع: یہ سچ ہے کہ سماجی زندگی کی موجودہ ہیئتوں کے اقتدار کی نمائندگی خاندان ہی کرتا ہے۔ لیکن بسا اوقات خاندانی روایات اور تہذیبی نمونوں کے درمیان اتنا بڑا فرق ہوتا ہے کہ دو متصادم اور متناقض معیاروں میں الجھ کر بچہ کہیں کا نہیں رہتا۔ مزید والدین کی تہذیبی کم مائیگی سے ڈسپلن کے مسائل کا قریبی تعلق ہوتا ہے۔ اکثر والدین تہذیبی اعتبار سے قدیم الخیال ہوتے ہیں اور اپنی بالادستی کے فرسودہ طریقوں سے اس قدر شدت کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں کہ نئی نسل کے رویّے کے نئے نمونوں کو ماننے کے لیے کسی صورت میں آمادہ نہیں ہوتے۔ ترقی پسند والدین کا رویہ اپنے بچوں کے ساتھ نہ تو حاکمانہ ہوتا ہے اور نہ پرستارانہ، بلکہ وہ بچوں کے معاملات میں ایک محبت کرنے والے رہنما کی مانند دلچسپی لیتے ہیں۔

خاندان بحیثیت تعلیمی ایجنسی: زمانۂ قدیم سے والدین ایک معلّم کا رول ادا کرتے چلے آئے ہیں، اگرچہ اس کی نوعیت اور وسعت، صورت حال کے مطابق بدلتی رہی ہے۔ بچہ گھر میں ہی چلنا اور بولنا سیکھتا ہے۔ جن چیزوں کو وہ دیکھتا اور کام میں لاتا ہے، اُن کے موٹے موٹے خواص میں تمیز کرنے لگتا ہے۔ بعض اخلاقی اقدار بھی، گھر کے ماحول ہی میں اس کے ذہن نشیں ہوجاتی ہیں۔ صحیح اور غلط، حق اور باطل کے درمیان فرق کرنا بھی وہ یہیں سیکھ لیتا ہے اور یہیں اُس کو بعض نہایت گہرے انسانی جذبات کا تجربہ بھی حاصل ہوتا ہے، یہاں تک کہ بالغ ہوجانے پر جب وہ اپنا گھر الگ بنالیتا ہے، تو بھی خاندان کا تعلیمی کام جاری رہتا ہے۔ خود اپنی اولاد کی پرورش کے دوران، وہ سربراہِ خاندان کے فرائض منصبی کی تعلیم وتربیت حاصل کرتا ہے۔ غرضیکہ اس کے لیے خاندان، عمر بھر، تعلیم کا ایک مستقل سرچشمہ بنا رہتا ہے۔

خاندانی ماحول میں فرد کو آزادی بھی حاصل ہوتی ہے اور اس پر بعض پابندیاں بھی عائد کی جاتی ہیں۔ جو کنبہ والدین، خاندانی روایات کے تابع ہوتا ہے، اُس میں افرادِ خاندان کو باہمی میل جول کے کافی مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس طریقے سے فرد اپنے کنبے کے دیگر افراد کے ساتھ نباہ کرنے کا سبق سیکھتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی شخصی انفرادیت بھی فروغ پاتی ہے۔

یاد رکھیے کہ بچپن کے سارے کے سارے طور طریق اور عادتیں، بنیادی حیثیت نہیں رکھتیں۔ بڑے ہونے پر اُن میں سے بعض کا نام ونشان تک باقی نہیں رہتا۔ دیرپا اور نمایاں خصوصیات اکثر بڑی عمر میں جڑ پکڑتی ہیں۔ البتہ جن بنیادی خصوصیات کی داغ بیل بچپن میں پڑ جاتی ہے، وہ دوسری خصوصیات کا مرکز بن جاتی ہیں، اور اس بات کا تعین کرتی ہیں کہ فرد اپنے ماحول سے کیا سیکھے گا اور کس طرح سیکھے گا۔

وسیع مفہوم میں، شخصیت کے یہ نمونے سماج کی مسلمہ تہذیب کے عین مطابق نہیں ہوتے۔ ان کا تعین زیادہ تر ماں اور ارکان خاندان کے رویّوں اور گھر کی مخصوص مادی خصوصیات کی بنا پر ہوتا ہے۔ لیکن خاندانی ماحول کی خصوصیات میں سے کوئی بھی خصوصیت مختلف بچوں کی شخصیت کے لیے مختلف نتائج کا موجب بن سکتی ہے اور اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ بچے نے اس ماحول کے ساتھ کیا تعلق قائم کیا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خاندان کی سماجی اور معاشی حیثیت، شوہر کی بیوی سے علاحدگی، بھائی بہن کے باہمی تعلقات اور بچے کی پیدائش کے لحاظ سے، بھائی بہنوں کے درمیان اس کی پوزیشن، ایسی چیزیں ہیں جن کا شخصیت پر زبردست اثر پڑتا ہے۔ لیکن بچے کی شخصیت کی تشکیل میں جو چیز سب سے زیادہ اثرانداز ہوتی ہے وہ ہے وہ جذباتی رشتہ جو بچہ، اس کے والدین اور بھائی بہن کے درمیان قائم ہوتا ہے۔

اگر آپ شخصیت کی ہم آہنگ نشوونما چاہتے ہیں تو گھر کی تنظیم اس طرح کرنی ہوگی کہ گھر ایک ایسی جگہ ہو (1) جہاں بچے کو اپنی سلامتی اور تحفظ کا یقین ہو۔ یہ سلامتی وتحفظ، سامانِ خوردونوش فراہم کرنے اور نفسیاتی ضروریات پورا کرنے تک ہی محدود نہ ہو، بلکہ جذباتی استحکام کا بھی حامل ہو، (2) جہاں احساسِ ذمے داری وخود اختیاری کی نشوونما کی جاسکے، (3) جہاں تازہ بہ تازہ اور ہر دم ترقی پذیر منزلِ مقصود اور آدرشوں کی طرف قدم بڑھا سکے اور (4) جہاں اُسے اپنے والدین، بھائی بہن اور گردوپیش کے لوگوں کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں مدد ملے۔

ذمے داری کی تربیت میں کوتاہ نظری سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہ مناسب نہیں کہ ذمے داری کے مفہوم کو اتنا محدود کردیا جائے کہ بچے یہ سمجھیں کہ ان کی ذمے داری صرف والدین کی خواہشات کو پورا کرنا ہے۔ کمیونٹی کی ضروریات اور مفادات کو مدِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے اور اس لحاظ سے بچوں کو ان کی ذمے داریوں سے ضرور آگاہ کیا جائے۔ والدین کو چاہیے کہ ذمّے داری کی تربیت کے وقت اس پہلو کو دھیان میں رکھیں۔

یاد رکھیے کہ ابتدائی عمر میں، بچہ اپنے آدرش کی تلاش، اپنے والدین کے طرزعمل میں کیا کرتا ہے۔ بچے کو یہ سکھانے کے لیے کہ اس کی منزل مقصود اور

آدرش کیا ہیں، اس سے زیادہ اور کوئی چیز مفید نہیں کہ بچے کے ساتھ والدین کے برتاؤ میں مستقل مزاجی اور باقاعدگی ہو۔ بچے میں جس قدر پختگی بڑھتی جائے، والدین کا مطمح نظر بھی اس کی مناسبت سے بدلنا اور بلند ہونا چاہیے۔ بچے کی مدد کی جائے کہ وہ گھر کی مقررہ حدود سے باہر نکل کر، اپنے آدرشوں کی خاطر، وسیع تر دنیا میں قدم رکھے۔ سب سے زیادہ صحت مند حالت وہ ہے، جس میں بچے کے آدرش، اس کی موجودہ ذہنی قوتوں سے قدرے ماورا ہوں، کیونکہ اس صورت میں وہ آدرش، بچے کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن سکیں گے۔ مگر یہ آدرش اتنے اونچے بھی نہ ہونے چاہئیں کہ بچے کی ہمت ٹوٹ جائے۔ کسی حالت میں بھی والدین کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اپنی ناکام اور نامکمل پیشہ ورانہ یا ازدواجی، یا دوسری قسم کی آرزوؤں کو بچوں پر مسلط کریں۔ بہترین راہ یہ ہے کہ اُن کی مدد اس طرح کی جائے کہ بچے اپنی قسمت کے مالک خود بن جائیں۔ جدید جمہوری سماج میں یہ حقیقت برابر تسلیم کی جارہی ہے کہ بچے کی شخصیت کو فروغ دینے کے بہترین حالات اُن خاندانی رشتوں میں پائے جاتے ہیں، جہاں بچوں کی جسمانی ناپختگی کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے والدین اور ان کے بچے، مساوات کے اصول کی بنیاد پر مل جل کر کام کرتے ہیں۔

ہندستانی خاندان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اطاعت، تسلیم و رضا اور فرماں برداری پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ خاندانی ذمے داریوں کے سلسلے میں تاکید پر تاکید کی جاتی ہے۔ خاندان میں رہتے ہوئے اگر کوئی شخص اپنی سلامتی چاہتا ہو، تو اُسے اُن فرائض کو قبول کرنا ہوگا جو اُسے تفویض کیے جائیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر زندگی میں اُسے کسی بحران سے دوچار ہونا پڑا تو خاندان کے جملہ افراد اُس کی مدد کریں گے۔[7]

خاندان بحیثیت سماجی نظام: بچے کی زندگی میں، سماجی ذہنیت پیدا کرنے والا سب سے پہلا ذریعہ خاندان ہے۔ لیکن جن ملکوں میں صنعت کاری بے انتہا ترقی یافتہ ہے، بچوں پر خاندان کا اثر، رفتہ رفتہ کم ہوتا جارہا ہے۔ ان ملکوں میں معاشی ضروریات نے ایسی صورت حال پیدا کردی ہے کہ باپ اور ماں دونوں، دن بھر کام کرنے پر مجبور ہیں اور اس وجہ سے بچے، اپنے والدین کی ذاتی توجہ سے محروم ہوگئے ہیں۔ ہندستان جیسے ترقی پذیر ملک میں اور خاص طور پر اس کے صنعتی علاقوں میں، اسی طرح کی صورت ہوتی جارہی ہے۔ لہٰذا بعض اوقات اس قسم کی تجاویز سامنے آتی ہیں کہ اخلاقی اور سماجی ذمے داری کا کام جسے کسی وقت خاندان کلیتاً انجام دیتا تھا، اب بڑی حد تک اسکول کو سنبھال لینا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ بچوں کی پرورش کے سلسلے میں، خاندان کے ہاتھوں سے اس کے بعض روایتی امور نکلتے جارہے ہیں اور یہ میلان برابر بڑھتا ہی جارہا ہے، مثلاً بچے کی جسمانی صحت کی ذمے داری میں، صحت عامہ کی ایجنسیاں بھی اب شریک ہوتی جارہی ہیں، لیکن بچے کی زندگی کو سماجی ڈھانچے میں ڈھالنے والی ابتدائی ایجنسی ابھی تک خاندان ہی ہے اور اس بات کا بہت کم امکان ہے کہ کسی زمانے میں خاندان اپنی اس حیثیت سے (تاوقتیکہ خاندان کا کوئی دوسرا نعم البدل معلوم نہ کرلیا جائے) محروم ہوجائے گا۔ معمولی سماج تو ایک طرف، صنعتی اعتبار سے بہت زیادہ ترقی یافتہ سماج میں بھی ایسا ہونا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔

بچے کے لیے خاندان ہی سب سے ابتدائی اور سب سے زیادہ مؤثر سماجی نظام ہے اور یہی ایک ایسی صورتِ حال فراہم کرتا ہے، جو بچے کی سماجی تربیت کے لیے بہت زیادہ سازگار ہے۔ ہمیں پہلے خاندان پر، ایک سماجی نظام کی حیثیت سے غور کرنا ہے اور پھر یہ دیکھنا ہے کہ خاندان کیونکر سماجی تربیت کے لیے ایک ماحول مہیا کرتا ہے۔

خاندان، اس مفہوم میں ایک سماجی نظام ہے کہ اس کے ذریعے، رفاقت اور محبت کے رشتے اور لوگوں کے درمیان باہمی تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیات جو کسی سماج کی بنیاد ہوتی ہیں، خاندان کے علاوہ اور کسی سماجی ماحول میں اتنی پائیدار نہیں ہوسکتیں۔ دوسرے سماجی گروہوں کی مانند خاندان بھی شخصیتوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے، فرق اتنا ہے کہ خاندان کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص طرح کے جذباتی رشتے میں بندھے ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے خاندان ایک نادر قسم کا سماجی نظام ہے۔

پہلے ہندستانی خاندان کے داخلی معاملات، کلی طور پر، سربراہِ خاندان کے تحت ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ رجحان زور پکڑ رہا ہے کہ اراکین خاندان کے باہمی رشتوں کو جمہوری اصولوں کے مطابق قائم کرنا چاہیے۔ یہ احساس دن بہ دن بڑھتا جاتا ہے کہ والدین اور اولاد کے درمیان اور شوہر اور بیوی کے مابین خاندانی معاملات میں برابری ہونی چاہیے۔ تاہم اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ بحیثیت سماجی نظام، خاندان کی اہمیت گھٹا دی جائے، کیونکہ خاندان کے ہر فرد کی ذمے داریاں اور مراعات، فرائض اور حقوق، اب تک بدستور واضح اور الگ الگ ہیں۔ منشا یہ ہے کہ بچہ اسکول میں داخل ہوتے وقت کوئی سادہ تختی نہیں، جس پر کوئی شخص اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے، لکھ دے۔ اس کے برخلاف، بچہ جب اسکول میں داخل ہوتا ہے، تو اپنے ساتھ چند تصورات، چند رجحانات اور بعض مخصوص طرزِ عمل لاتا ہے، جو اس کی خاندانی تربیت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسکول کی فضا میں جن تازہ تجربات سے وہ دوچار ہوتا ہے، وہ اس کے سابقہ تجربات اور تصورات کو یا تو بالکل بدل دیتے ہیں یا اور مضبوط کردیتے ہیں۔ تاہم جو نمونے خاندان نے قائم کیے ہیں، وہی بچے کی آئندہ سماجی تربیت کے لیے بنیاد کا کام دیتے ہیں۔

اب ہم ایک دوسرے نقطۂ نگاہ سے خاندان پر نظر ڈالتے ہیں، یعنی خاندان کا ماحول کس قسم کے تعلیمی مواقع فراہم کرتا ہے۔ یہ مواقع اپنی کیفیت کے لحاظ سے اُن تمام مواقع سے مختلف ہوتے ہیں، جو بچے کو آئندہ حاصل ہوں گے۔ اولاً وہ اپنی طفولیت اور اسکول میں داخل ہونے سے پہلے کی

زندگی، کلیتاً اپنے خاندان کے بزرگوں کی حفاظت اور نگرانی میں گزارتا ہے۔ اس دور میں، اُس کی سمجھ پختہ نہیں ہوتی اور خاندان اُسے جس سانچے میں ڈھالنا چاہے، ڈھال دیتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنی مادّی ضروریات کے لیے خاندان کے عمر رسیدہ افراد کا محتاج ہوتا ہے بلکہ اس کی ذہنی اور سماجی ضروریات کا دارومدار بھی ان ہی لوگوں پر ہوتا ہے۔ اس وقت تک نہ اُسے کوئی ذاتی تجربہ ہوتا ہے اور نہ اس کے پاس اپنے جداگانہ معیار ہی ہوتے ہیں، جن کی مدد سے وہ بذاتِ خود بھلے برے کی پہچان کر سکے۔ لہٰذا یہی زمانہ اس کی زندگی میں سب سے زیادہ تعلیم کے لیے سازگار ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جن چیزوں کو وہ اول چند برسوں میں سیکھتا ہے، ان کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ان کا تعلق اس کے جسمانی وظائف سے ہے۔ جیسے کھانا، پینا، منہ ہاتھ دھونا، اور رفع حاجت کی تربیت۔ یہ کام جس قسم کی سماجی تعلیم کے حامل ہیں، وہ بچے کی ذاتی نشوونما کے لیے بہت اہم ہیں۔ سوم، جو چیز خاندانی ماحول کے دوسرے ماحولوں سے مُمیز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ اول الذکر جذبات سے سرشار ہوتا ہے اور خاندان کے جذباتی بندھن تعلیم کے عمل پر زبردست اثر ڈالتے ہیں۔ مثلاً اگر بچے کا طرزِ عمل بُرا ہے یا وہ کوئی نمایاں کامیابی حاصل کرتا ہے، تو دونوں صورتوں میں، والدین کو ان باتوں کا جس قدر اور جتنا احساس ہوگا، بچے کے ہم جولی یا اُس کے مدرسین اتنا خیال یا احساس نہیں کر سکتے۔ یہ تین عناصر ایسے ہیں جو خاندانی حلقے میں بچے کی تعلیمی صورتِ حال کو انتہائی حساس بنانے کا باعث ہیں۔ گھر پر جو سبق سیکھ لیے جاتے ہیں، ان کے اثرات بہت گہرے اور پائیدار ہوتے ہیں، یہاں تک کہ بعد ازاں، اسکول میں یا کھیل کے میدان میں یا کسی اور جگہ نئے تجربات حاصل ہونے کے باوجود یہ اثرات، عمر بھر بچے کے ذہن سے زائل نہیں ہوتے۔

اس سلسلے میں یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ بچے کو خاندان سے جو کلچر منتقل ہوتا ہے۔ اس کی نوعیت بالکل مخصوص ہوتی ہے۔ ایک زیادہ بڑی جماعت مثلاً قوم کے کلچر کے علاوہ، خاندان ایک چھوٹے سے گروپ کے کلچر کا بھی حصہ ہوسکتا ہے جو بعض اعتبارات سے قومی کلچر سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ کسی بڑی جمعیت کے جملہ کلچروں میں زبردست اختلافات پائے جاتے ہیں، جن کی بنیاد، طبقہ، ذات پات، مشرب وملت وغیرہ پر قائم ہوتی ہے۔ ان عناصر میں سے کسی بھی بنیاد پر ایک گروپ کا ضمنی کلچر، جو امتیازی خصوصیات رکھتا ہے، وہ کمسن بچے کی طرف، خاندان کے ذریعے سے منتقل ہوتا ہے۔ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے، جسے اسکول خطرہ مول لیے بغیر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے خاندان، اپنی اپنی اولاد سے، جدا جدا توقعات رکھتے ہیں ان کی تربیت کے طریقے بھی بڑی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً گھر کی تعلیمی صورت حالات کے مطابق، ہر خاندان، جزا وسزا کی مختلف تدبیریں استعمال میں لاتا ہے۔ لہٰذا ایک ہی درس گاہ اور ایک ہی جماعت میں بچوں کے محرکاتِ عمل کے انداز میں، زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ تعلیم میں بہرکیف، ان اختلافات کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔

ہندستان اور دوسرے ممالک میں بہت سے مطالعے کیے گئے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکول بحیثیت سماجی ادارہ، بچے کی تعلیم کے لیے، متوسط طبقے کی مخصوص اغراض اور ضابطۂ اخلاق کو اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض بچوں کے خاندان اس چیز کو پسند کرتے ہوں، مثلاً اعلا طبقے کے خاندان توقع کیا کرتے ہیں کہ ان کے لیے ہائی اسکول اور کالج سے امتیازی شان کے ساتھ کامیاب ہوں اور بعد ازاں اعلا اور مقتدر عہدے سنبھالیں، جب کہ اسکول متوسط طبقے کی اقدار، مثلاً مساوات، اخوت اور باہمی امداد کا اعلان، بیانگ دُہل کرتا رہتا ہے۔ اس کے برخلاف ادنا طبقے کے خاندانوں کی نظر میں تعلیم کی غرض یہ ہے کہ ان کے بچوں کو کسی پیشے کے لیے تیار کیا جائے۔ لہٰذا وہ متوسط طبقے کی سماجی اقدار سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے۔ ان طبقاتی اختلافات کا عکس، بچوں کے اُن رویّوں میں پایا جاتا ہے، جو وہ اسکول میں اختیار کرتے ہیں، مثلاً ڈسپلن، ہدایات کی بجا آوری (حالات سے مطابقت) اور حصولِ استعداد وغیرہ، کی طرف ان کا طرزِ عمل ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ لہٰذا اسکول کو یہ تمام حقائق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ مثالوں میں، اسکول اور خاندان کے مقاصد یکساں ہوں اور بعض اعتبارات سے وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں۔ اسکول کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے پروگرام مرتب کرنے میں اور ان پر عمل آوری کے وقت اس چیز کو مدِ نظر رکھے۔

حواشی:

1. Freeman, F.N. & others, "The Influence of Environment on the Intelligence, School Achievement and Conduct of Foster Children", Twenty-Seventh Year book of the National Society for the study of Education. (1928), Pt.I, pp. 103-217.
2. Benedict, Ruth, "Patterns of Culture" London, Routledge & Kegan Paul Ltd., 1952. p.2.
3. Mamoria, C.B. "Social Problems and Social Organisation in India". Allahabad, Kitab Mahal (P) Ltd., 1965. pp. 87-88.
4. Nisbet, John, "Family Environment and Intelligence", in Education, Economy and Society, edited by Halsey, A.H. & others, New York, The Free Press, 1961. pp. 273-87.
5. Tagore, Rabindranath "Gitanjali" London, Macmillan & Co., Ltd., 1951 p.6.
6. Symonds, P.M. "The Psychology of Parent-Child Relationship." New York, Appleton-Century, 1939.
7. Carstairs, G.M. "The Twice-Born". London, The Hogarth Press, 1968. p. 147.

□□□

زبیر احمد بھاگلپوری کیریئر گائیڈنس

آئی.آئی.ٹی (اسکریننگ ٹسٹ) کی تیاری کیسے کریں

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (.I.I.T) ہندستان ہی نہیں بیرون ملک کے ممتاز ترین انجینئرنگ اداروں میں شامل ہے، جہاں سے نکلنے والے طلبہ ملک و بیرون ملک دونوں جگہ اپنی بیش بہا خدمات فخریہ طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انجینئرنگ کے ہر طالب علم کی پہلی کوشش آئی.آئی.ٹی. میں ہی داخلہ لینے کی ہوتی ہے۔

چونکہ آئی.آئی.ٹی. کی شاخیں بہت کم ہیں اور امیدواروں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، اس کا مسابقتی امتحان نسبتاً سخت ہوتا ہے۔ اس لیے طلبہ کو شروع سے ہی اس کی تیاری انتہائی احتیاط سے کرنی چاہیے— اس میں داخلے کا اوّلین مرحلہ اسکریننگ ٹسٹ یا ابتدائی امتحان کا ہوتا ہے۔ اس کے لیے ملک کے تمام بڑے شہروں میں مراکز قائم کیے جاتے ہیں تاکہ طلبہ امتحان میں شرکت کے لیے بہت دور جانے کی ضرورت نہ پڑے۔ یوں تو آئی. آئی. ٹی. کو بطور کیریئر منتخب کرنے والے امیدوار عموماً میٹریکولیشن سے ہی اس کی تیاری شروع کردیتے ہیں لیکن بطور خاص آئی. ایس. سی. کے دوران کی تعلیم اس طور اہم ہوجاتی ہے کہ .I.Sc کے ساتھ ہی .I.I.T کے داخلہ امتحان کا بنیادی مواد بھی طلبہ کو اس سے فراہم ہوجاتا ہے۔ اسکریننگ ٹسٹ میں کامیابی کے لیے طلبہ کو خاص طور پر درج ذیل نکات کو مدِنظر رکھتے ہوئے تیاری کرنی چاہیے۔

(i) **مجوزہ نصاب کا مطالعہ:** وقتاً فوقتاً نصابِ تعلیم میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن عموماً علم کیمیا، ریاضیات اور علم حیات سے ہی اسکریننگ ٹسٹ میں سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انجینئرنگ کے دیگر اداروں کے داخلہ امتحان کے مقابلے آئی. آئی. ٹی. داخلہ امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات بالکل مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ سوالات بالکل سخت اور پیچیدہ پوچھے جاتے ہیں۔ اپنی امتیازی خصوصیت قائم رکھنے کے لیے .I.I.T نئے طرز و انداز کا سوال سیٹ کرتی ہے اس لیے سوالات کے نیچر مختلف ہونے کے سبب تیاری کے لیے خصوصی مشق اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عموماً ایسا دیکھا جاتا ہے کہ کسی طالب علم کو کسی خاص باب کی جانکاری زیادہ اور کسی کی کم ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں نصاب کے ابواب کے درمیان مناسب ہم آہنگی پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ طلبہ کو دورانِ مطالعہ تمام ابواب کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے اور یہ کوشش کرنی چاہیے کہ نصاب کا کوئی گوشہ کمزور نہ رہنے پائے۔

(ii) **گزشتہ ''' ۔ کا مطالعہ:** سوالات کے نیچر اور ان کے طرز و انداز سے حقیقی واقفیت کے لیے گزشتہ برسوں کے سوالناموں کا مطالعہ بے حد مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس سے سب سے پہلا اور بڑا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کو متعینہ وقت کے اندر جواب لکھنے کی پریکٹس کا موقع فراہم ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان سوالات کی بنیاد پر آئندہ امتحان میں پوچھے جانے والے ممکنہ سوالات کا انتخاب کرنے میں بھی انھیں سہولت ہوتی ہے۔ خاص طور سے پہلی بار داخلہ امتحان میں شرکت کرنے والے طلبہ کو گزشتہ برسوں میں پوچھے گئے سوالات اور متعلقہ ابواب (chapters) کے درمیان نمبرات اور سوالات کی تعداد متعین کرنے میں کافی مدد ملتی ہے— ان تمام باتوں کے باوجود طلبہ کو یہ نکتہ بھی اچھی طرح ذہن نشیں رکھنا چاہیے کہ ہر سال عموماً داخلہ امتحان میں پوچھے گئے سوالات کی تعداد اور ان کے نمبروں میں تنوع دیکھا گیا ہے۔ متعینہ تین گھنٹے میں اس سیشن کے لیے پوچھے جانے والے سوالات کے ہر صحیح جواب کے تین نمبر ہوتے ہیں اور ہر غلط جواب کے لیے ایک نمبر گھٹانے کا نظم ہوتا ہے بالفاظ دیگر Minus Marking ہوتی ہے۔ اسی طرح سوالوں کی تعداد کے بارے میں بھی اندازہ لگایا

خصوصی مشورے

(1) ہر سوال کو حل کرتے وقت مثبت نقطۂ نظر اپنائے رکھیں۔

(2) مطالعہ اور تاریخ امتحان کے درمیان وقت کی منصوبہ بندی کرکے ہی تیاری کریں۔

(3) سوالنامہ کو حل کرتے وقت خود اعتمادی قائم رکھیں، تذبذب میں نہ رہیں۔

(4) متعینہ تین گھنٹوں میں جواب دیتے وقت یہ بھی خیال رکھیں کہ غلط جواب دینے پر نمبر کاٹ دیے جائیں گے۔

(5) امتحان کی تاریخ سے قبل ماڈل پیپروں کو مشقی ٹسٹ کے ذریعے وقت کی منصوبہ بندی کرکے اپنا محاسبہ کریں۔

(6) مشقی ٹسٹ پیپر حل کرتے وقت باہری مدد بالکل نہ لیں۔ یہی آپ کی ایماندارانہ تیاری کا تقاضہ ہے۔ اس سے سوالات حل کرنے کی آپ کی صلاحیت میں کمی آتی ہے۔

جاسکتا ہے۔ ریاضیات، علم کیمیا اور علم حیات میں سے پوچھے گئے سوالات کی تعداد بھی نشیب وفراز سے گزرتی رہتی ہے۔ یہ کسی سال 1.5 (35 ہر ایک) تو کسی سال 90 (30 ہر ایک) ہوتی ہے۔ اس طرح موٹے طور پر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان سوالات کی تعداد تقریباً 100 ہوگی۔

(iii) **کامیاب طلبہ سے رابطہ:** صرف آئی.آئی.ٹی. ہی نہیں، ہر مسابقتی امتحان میں شامل ہونے سے پہلے امیدواروں کو اپنے سینئر کامیاب طلبہ سے رابطہ کرکے ان کے تجربات حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے کیوں کہ جس راستے پر آپ سفر کرنے جارہے ہیں، اس کے نشیب و فراز سے وہ واقف ہوچکے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ جن طلبہ نے کامیابی تو نہیں حاصل کی لیکن تیاری کی ہو، ان سے بھی رابطہ کرکے تیاری کے لائحہ عمل سے روشناس ہونے کی سعی کرنی چاہیے۔ ان کی ہدایات بھی ایسے امتحانات میں کارگر ثابت ہوتی ہیں۔ اخبارات اور مسابقتی رسائل کا مطالعہ بھی اس کی تیاری کے لیے ازحد ضروری ہوتا ہے۔ اس میں ماہرین کے ذریعے وقتاً فوقتاً پیش کی گئی باریکیاں طلبہ کی کامیابی میں ہمیشہ مددومعاون ثابت ہوتی ہیں۔ ان رسائل میں گاہے بگاہے کامیاب طلبہ کے انٹرویو شائع ہوتے ہیں جن سے مفید کتابوں کے ساتھ ساتھ امتحان میں شرکت کے سلسلے میں ان کے افکار وخیالات کے متعلق جانکاری بآسانی حاصل ہوجاتی ہے۔

(iv) **کوچنگ مراکز سے رابطہ:** آج کل تقریباً ہر بڑے شہر میں امیدواروں کی رہنمائی کے لیے پرائیویٹ کوچنگ مراکز موجود ہیں جہاں بہت سے طلبہ یکجا مل جاتے ہیں۔ طلبہ سے آپسی تعامل (Interaction) کے ذریعے بھی اپنی بہت سی خامیوں کو دور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے علاوہ کوچنگ مراکز میں پڑھانے والے ماہر اساتذہ سے حاصل ہونے والے نکات طلبہ کی تیاری کو صحیح سمت میں لے جانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ تیاری کے لیے کون کون سی کتابیں مفید ہیں یا کامیابی کے لیے کیا لائحہ عمل اپنانا چاہیے، یہ ساری باتیں طلبہ کو کوچنگ مراکز میں بتائی جاتی ہیں۔

(v) **مستند اور مناسب کتابوں کا انتخاب:** یوں تو بک اسٹال پر بہت سی کتابیں دستیاب ہیں لیکن طلبہ کو اس سلسلے میں احتیاط سے کام لیتے ہوئے مستند اور مناسب کتابوں کا ہی انتخاب کرنا چاہیے۔ آئی.آئی.ٹی. اسکریننگ ٹسٹ خاص طور پر بنیادی تھیوریز کی فہم اور خصوصی حالات میں تیزی سے جواب دینے کی صلاحیت کی جانچ کے لیے منعقد کیا جاتا ہے۔ اس لیے امیدواروں کو ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اسکریننگ کے لیے منعقد امتحان میں ہمیشہ موضوعات سے متعلق آپ کی بنیادی معلومات، ان پر آپ کی گرفت اور آپ کے ذریعے متعینہ وقت کے اندر سوالات کو حل کرنے میں کی گئی مشق ہی آپ کو کامیابی سے ہمکنار کرسکتی ہے۔ لہٰذا بنیادی تھیوریز کے لیے حسب نصاب معیاری کتابوں کا انتخاب اور منصوبہ بند مطالعہ آپ کی سرفرازی کے لیے کافی معنی رکھتا ہے۔ بنیادی تھیوریز کی معلومات کے بعد آپ کسی بھی سوال کا حل ڈھونڈنے کے اہل ہوسکتے ہیں۔

(vi) **وقت کی منصوبہ بندی:** امتحان کی تاریخ سے قبل حل شدہ سوالنامہ یا Set practice پر زیادہ توجہ دے کر وقت کی منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ طلبہ کو سیٹ پریکٹس سے منتخب کسی ایک سوالنامے کو متعینہ وقت کے اندر حل کرکے اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔ اس مشقی ٹسٹ کے ذریعے جہاں آپ سوالوں کے طرز یا پیٹرن کی جانکاری حاصل کرتے ہیں وہیں آپ وقت کی منصوبہ بندی کے ذریعہ اپنی تیاری کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں۔

(vii) **مشقی امتحان (Practice Test):** مشق و مزاولت کے دوران سوالات کو حل کرتے وقت کسی قسم کی بیرونی مدد نہ حاصل کریں۔ صحیح تیاری کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ سوالات خود حل کرنے کی کوشش کریں تاکہ پتہ چل سکے کہ آپ نے کتنے سوالوں پر کتنا وقت صرف کیا ہے۔ براہِ راست کسی قسم کی خارجی مدد حاصل کرکے سوالات کو حل کرنے سے نہ صرف یہ کہ آپ کی ایماندارانہ کاوش اور خود اعتمادی میں کمی آجاتی ہے بلکہ ساتھ ہی آپ کی کامیابی کا امکان بھی کم ہونے لگتا ہے۔

مذکورہ بالا نکات صرف آپ کی تیاری کو صحیح نہج عطا کرنے کی خاطر پیش کیے گئے ہیں ورنہ پُرخلوص محنت اور عرق ریزی کے بغیر ان کا کوئی معنی نہیں۔

□□□

جوابات کوئز:

1-د	2-الف	3-ب	4-ب	5-د	6-الف	7-ب
8-ج	9-د	10-الف	11-ج	12-ج	13-ج	14-ب
15-الف	16-ج	17-ج	18-ج	19-الف	20-ب	21-الف
22-ج	23-الف	24-ب	25-ج	26-د	27-الف	28-ب
29-ج	30-ج	31-الف	32-د	33-ب	34-ب	35-د
36-ب	37-ج	38-الف	39-ج	40-ب	41-ج	42-الف
43-ب	44-الف	45-ج	46-الف	47-ب	48-د	49-د
50-الف	51-ب	52-الف	53-ج	54-ب	55-الف	56-ب

شفقت علی

ویب اور HTML

ویب پیج میں ٹیبل بنانا:

ڈاٹا کو مختلف کالموں اور قطاروں کی شکل میں ظاہر کرنے کے لیے ٹیبل استعمال کیے جاتے ہیں۔ جو ٹیبل <TABLE> اور </TABLE> ٹیگ کے ذریعے بنائے جاتے ہیں اور ان ٹیگز کے درمیان ٹیبل سے متعلقہ دوسری کمانڈیں دی جاتی ہیں۔ اگر آپ ان ٹیگز سے باہر ٹیبل کی کوئی کمانڈ دیں گے تو براؤزر اسے قبول نہیں کرے گا۔

ٹیبل کی قطار بنانا:

ٹیبل میں سیلز کی قطار بنانے کے لیے <TR> اور </TR> ٹیگ استعمال ہوتے ہیں۔ آپ کو جتنی قطاروں کی ضرورت ہو آپ اتنی دفعہ یہ ٹیگ استعمال کریں گے۔

ٹیبل کا سیل بنانا:

ٹیبل میں سیل دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم کالم کی ہیڈنگ کے لیے اور دوسری قسم عام ڈاٹا ڈالنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ سیل کو ہیڈنگ کے طور پر استعمال کرنے کے لیے آپ <TH> اور </TH> ٹیگ لگا سکتے ہیں۔ اس ٹیگ کی بدولت آپ کی ہیڈنگ خود بخود بولڈ ہو جائے گی۔ اگر آپ ایسا ٹیبل بنا رہے ہوں جس میں تین کالم اور تین قطاریں ہوں تو اس کے لیے مندرجہ ذیل طریقے سے ٹیگ استعمال ہوں گے:

```
<TABLE>
    <TR>
          <TH>Header 1</TH>
          <TH>Header 2</TH>
          <TH>Header 3</TH>
    </TR>
    <TR>Data 1</TR>
    <TR>Data 2</TR>
</TABLE>
```

اگر آپ ڈاٹا کو مزید فارمیٹ کرنا چاہتے ہیں تو اس فارمیٹ کے متعلقہ ٹیگ <TD> اور </TD> ٹیگز کے درمیان لکھیں۔ اس کی مثال کے لیے ہم وہی ٹیبل استعمال کریں گے جو ہم نے ابھی اوپر بنایا ہے:

```
<TABLE>
   <TR>
        <TH>Header 1</TH>
        <TH>Header 2</TH>
        <TH>Header 3</TH>
   </TR>
   <TR>Data 1
   <TD>Data2</TD>
   <TD>Data3</TD>
   </TR>
   <TR>
   <TD>Data4</TD>
   <TD>Data5</TD>
   <TD>Data6</TD>
   </TR>
</TABLE>
```

سیلز میں ڈاٹا کی الائنمنٹ:

ٹیبل کی خوبصورتی میں الائنمنٹ کافی اضافہ کرتی ہے۔ سیلز میں الائنمنٹ افقی اور عمودی سمتوں میں ہوتی ہے۔ افقی الائنمنٹ میں آپ Center, Left جبکہ عمودی الائنمنٹ میں Top، Middle اور Bottom دے سکتے ہیں۔ تحریر کو سیلز کے نچلے حصے کے مطابق الائن کرنے کے لیے ٹیگ کے اندر align="Bottom" لکھیں گے۔

ٹیبل کی الائنمنٹ:

پورے ٹیبل کی الائنمنٹ کے لیے آپ <TABLE> ٹیگ کے اندر align کی کلاز استعمال کر سکتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ ٹیبل کو ونڈو کے درمیان میں رکھنا چاہتے ہیں تو مندرجہ ذیل کمانڈ دیں گے:

```
<TABLE  align="center">
```

پوری قطار کی الائنمنٹ:

اگر آپ پوری قطار میں موجود تمام سیلز کی ایک ہی الائنمنٹ کرنا چاہتے ہیں تو <TR> ٹیگ میں مطلوبہ الائنمنٹ لکھی جاتی ہے۔

(نوٹ: سیل کی الائنمنٹ کے لیے آپ <TD> کمانڈ میں اور قطار کی الائنمنٹ کے لیے <ROW> کمانڈ کے ساتھ اور ٹیبل کی الائنمنٹ کے لیے <TABLE> کمانڈوں میں ہر ایک کے ساتھ " "=align کلاز استعمال کر سکتے ہیں۔)

ٹیبل کی چوڑائی مخصوص کرنا:

<TABLE> ٹیگ کی اضافی کلاز WIDTH کے ذریعے آپ اس بات کا

تعین کر سکتے ہیں کہ براؤزر ونڈو میں ٹیبل کتنا چوڑا ظاہر ہوگا۔ آپ ٹیبل کی چوڑائی پکسلز میں یا ونڈو کے سائز کے مطابق فیصد میں WIDTH کلاز کے ساتھ مخصوص کر سکتے ہیں۔

عام طور پر WIDTH کلاز اس بات کا تعین کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے کہ اگر ٹیبل کسی بھی چوڑائی والی ونڈو میں کھلے تو وہ اس ونڈو میں پھیل جائے — اگر آپ مندرجہ ذیل کمانڈ لکھیں گے تو ٹیبل پوری ونڈو میں پھیل جائے گا:

```
<TABLE WIDTH=100%>
```

ٹیبل کو بارڈر لگانا:

ٹیبل کو بارڈر لگانے کے لیے آپ <TABLE> کمانڈ میں border=n کی کلاز استعمال کرتے ہیں۔ n کی جگہ آپ پکسل کی مقدار دیں گے۔ اوپر مثال میں بنائے گئے ٹیبل کو بارڈر لگانے کے لیے اس کے کوڈ میں بارڈر کی کمانڈ دے سکتے ہیں۔

سیلز کا درمیانی فاصلہ:

سیل کے مندرجات اور سیل کے بارڈر کے درمیان خالی جگہ کو cell padding کہتے ہیں۔ آپ <TABLE> کی اضافی کلاز CELLPADDING کے ذریعے اس خالی جگہ کی مقدار مخصوص کر سکتے ہیں۔

سیلز کے درمیان خالی جگہ دینا:

آپ سیلز کے درمیان خالی جگہ کو بھی کنٹرول کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے <TABLE> ٹیگ کی اضافی کلاز CELLSPACING استعمال ہوتی ہے۔ سیلز کی درمیان جگہ بڑھانے سے سیلز کے درمیان موجود بارڈر بھی بڑھتا ہے۔

مخصوص حروف کا استعمال:

مارک اپ لینگویج میں آپ > کی علامت ٹیگز میں استعمال کرتے ہیں اس لیے عام تحریر میں یہ حرف استعمال نہیں کر سکتے، اگر آپ یہ علامت ٹائپ کر دیں گے تو براؤزر اسے کسی ٹیگ کا ابتدائی حصہ سمجھے گا اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے گا۔ تاہم اگر آپ اس علامت کو استعمال کرنا چاہتے ہیں تو مخصوص طریقہ کار کے ذریعے ہی کر سکتے ہیں۔

ذیل میں کچھ مخصوص حروف اور ان کو استعمال کرنے کے لیے ان کے کوڈ دیے گئے ہیں:

مخصوص حرف	کوڈ	مخصوص حرف	کوڈ
<	<	>	>
&	&	"	&quot

اگر آپ <BODY> لفظ ڈاکومنٹ کے اندر ایسے ہی علامتوں کے ساتھ تحریر کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو یوں ٹائپ کرنا پڑے گا: slt;BODYsgt;

کچھ ایسے حروف جو کی بورڈ پر میسر نہ ہوں ان کو بھی آپ مخصوص کوڈز کے ذریعے ہی استعمال کر سکتے ہیں جیسے:

ç c à a

تقریباً تمام ورڈ پروسیسرز بعض اوقات وہاں سے لائن توڑ دیتے ہیں جہاں آپ کو دو لفظ ایک ہی لائن میں لکھنا ہوتا ہے مثلاً فرض کریں کہ آپ Jahangir Book Depot لکھنا چاہتے ہیں اور Jahangir ایک لائن کے آخر میں اور Book Depot نئی لائن کے شروع میں چلے جاتے ہیں جو کافی برا محسوس ہوتا ہے۔ ایسا ہونے سے روکنے کے لیے آپ ان الفاظ کے درمیان نہ ٹوٹنے والی اسپیس ڈال دیتے ہیں جس کے لیے   کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً م A B لکھتے ہیں تو اس سے یہ ہوگا کہ AB کے درمیان سے لائن نہیں ٹوٹے گی۔ بالفرض اگر لائن توڑنے کی ضرورت پڑے گی تو بھی دونوں حروف اکٹھے ہی اگلی لائن میں جائیں گے۔

اس کے علاوہ کسی بھی مخصوص یا عام حرف کو استعمال کرنے کے لیے اس کا کوڈ نمبر لکھ دیں گے تو ڈاکومنٹ میں وہ پرنٹ ہو جائے گا۔ مثلاً اگر آپ A لکھتے ہیں تو A نظر آئے گا، اسی طرح † لکھنے سے پرنٹ ہو جائے گا۔

ای میل ایڈریس ڈالنا:

آپ ایک خصوصی ٹیگ کے ذریعے ڈاکومنٹ میں ای میل ایڈریس ڈال سکتے ہیں۔ استعمال کنندہ جب اس ایڈریس پر کلک کرے گا تو اس ایڈریس کے نام والی میل ونڈو کھل جائے گی جس میں آپ پیغام لکھ دیں گے اور یہ پیغام اسی ایڈریس پر پوسٹ ہو جائے گا۔ اس ٹیگ کی مثال درج ذیل ہے۔

```
<A HREF="mailto:compserv@thepentagon.com">Mail me</A>
```

URL کی خود بخود تبدیلی:

کسی پیج میں ایسا ٹیگ شامل کیا جا سکتا ہے جو ایک مخصوص دورانیہ گزرنے پر پیج کو خود بخود کسی اور URL سے تبدیل کر دے۔ مثال کے طور پر ذیل میں دیا گیا ٹیگ موجودہ پیج کو خود بخود تین سیکنڈز کے بعد http://domain/directory/file.html کی URL سے تبدیل کر دیتا ہے۔

```
<META HTTP-EQUIV="Refresh"
CONTENT="3;url=http://domain/directory/file.html">
```

(نوٹ: یہ ٹیگ <HTML> ٹیگ کے فوراً بعد لگانا ضروری ہے۔)

□□□

شمیم اختر

تاریخ ہند

(1) موہنجوداڑو اور ہڑپا کس ملک میں ہیں؟

(الف) بنگلہ دیش (ب) تبت

(ج) ہندستان (د) پاکستان

(2) کتبہ جات بحیثیت تاریخی ماخذ ادبی مواد سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ:

(الف) تاریخ فراہم کرتے ہیں

(ب) سیاسی واقعات قلمبند کرتے ہیں

(ج) عوامی امداد اور عطیات کا ذکر کرتے ہیں

(د) ان میں سے کوئی نہیں

(3) مندرجۂ ذیل ادوار کو تاریخی اعتبار سے ترتیب دیں:

(الف) پتھر کا زمانہ (ب) دور ماقبل تاریخ

(ج) لوہے کا دور (د) کانسہ کا زمانہ

(الف) ب، الف، د، ج (ب) الف، ب، ج، د

(ج) ج، ب، الف، د (د) د، ج، ب، الف

(4) وادیٔ سندھ کی تہذیب نے کس عہد میں زبردست ترقی کی؟

(الف) 3000ق.م. میں (ب) 2500ق.م. میں

(ج) 4000ق.م. میں (د) 5000ق.م. میں

(5) وادیٔ سندھ کی تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟

(الف) اس کا تنظیمی طریقہ (ب) اس کی تجارت

(ج) اس کی فوج (د) گاؤں کے زمینوں کی ترتیب جا نقشہ

(6) وادیٔ سندھ کی تہذیب میں مہریں کس چیز کی بنتی تھیں؟

(الف) پکّی اینٹ (ب) سونا

(ج) چاندی (د) کانسہ

(7) ہڑپا تہذیب کی دریافت کب ہوئی؟

(الف) 1911 (ب) 1921

(ج) 1925 (د) 1930

(8) موہنجوداڑو میں سب سے اہم عوامی مقام جو دریافت کیا گیا:

(الف) بڑا اناج کا گودام (ب) بڑا مندر

(ج) بڑا حمام خانہ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(9) وادیٔ سندھ کی تہذیب و تمدن کے زوال کی وجہ تھی:

(الف) آریہ قوم کا حملہ (ب) سیلاب

(ج) بارود کا گھٹنا (د) مذکورہ تمام

(10) سب سے قدیم وید ہے:

(الف) رگ وید (ب) سام وید

(ج) یجروید (د) اتھروید

(11) ہندستان میں آریوں کی حکومت سب سے پہلے کہاں قائم ہوئی؟

(الف) ہریانہ میں (ب) سندھ میں

(ج) پنجاب میں (د) اترپردیش میں

(12) رگ وید سے تعلق رکھنے والے آریہ کس دیوی کی پوجا کرتے تھے؟

(الف) اندرا (ب) سوریا

(ج) اُوشا (د) وایو

(13) اپنیشدوں میں کس پر بحث کی گئی ہے؟

(الف) خاندانی زندگی (ب) سماجی ترقی

(ج) روحانی ترقی (د) قومی ترقی

(14) لفظ "بھارت" کا ذکر سب سے پہلے کس کتاب میں ملتا ہے؟

(الف) سام وید (ب) رگ وید

(ج) یجروید (د) اتھروید

(15) ہندو قانون کی تدوین کس نے کی؟

(الف) منو (ب) اندرا

(ج) سوا (د) راما

(16) اپنیشد میں کس کی تعلیم دی گئی ہے؟

(الف) تپسیا (ب) کرما

(ج) گیان (د) بھگتی

(17) دراوڑی کی اصطلاح کس گروپ کو ظاہر کرتی ہے:

(الف) کاشتکاروں (ب) جنگجوؤں

(ج) ذات (د) زبانیں

(18) رگ وید کے زمانے میں جاناJanat ایک.........

(الف) سکہ تھا (ب) قبیلہ تھا

(ج) سیاسی یونٹ تھا (د) ذات تھا

(19) مہاتما بدھ نے کس مقام پر سب سے پہلے اپنا خطبہ دیا تھا؟

(الف) سارناتھ (ب) بودھ گیا

(ج) کشی نارا (د) کپل وستو

(20) بودھ مذہب میں نروان کا مطلب ہے:

(الف) موت سے آزادی (ب) دوبارہ جنم کی خواہش کا تدارک

(ج) جنت کا حصول (د) عظیم طاقت کا حصول

(21) جین مذہب کے 24ویں تیرتھنکر تھے:

(الف) مہابیر (ب) پرسوا ناتھا

(ج) شانتی ناتھا (د) رشی بھادیوا

(22) جین ازم کی تعلیمات کس مذہب سے ملتی جلتی ہیں؟

(الف) عیسائیت (ب) ہندوازم

(ج) بدھ ازم (د) فلسفہ ادویت

(23) سکندر نے ہندستان پر کب حملہ کیا؟

(الف) 326-327 ق.م. (ب) 328-329 ق.م.

(ج) 331-332 ق.م. (د) 335-336 ق.م.

(24) موریہ سلطنت کا صدر مقام تھا:

(الف) مگدھ (ب) پاٹلی پتر

(ج) کوسالا (د) پٹنہ

(25) ''ارتھ شاستر'' کا مصنف ہے:

(الف) ماگھا (ب) بھاوابھوتی

(ج) کوٹلیہ (د) کالی داس

(26) اشوک کی تخت نشینی کب ہوئی؟

(الف) 263 ق.م. (ب) 270 ق.م.

(ج) 272 ق.م. (د) 273 ق.م.

(27) بندوسار کس کا بیٹا تھا؟

(الف) چندر گپت موریہ (ب) اشوک

(ج) ہرش وردھن (د) کنشک

(28) اشوک کا فرمان کس زبان میں لکھا جاتا تھا؟

(الف) پالی (ب) برہمی

(ج) سنسکرت (د) پراکرت

(29) موریہ کی حکومت میں ٹکشیلا کس لیے مشہور تھا؟

(الف) گندھارا آرٹ کی مرکزیت (ب) تجارت کا مرکز

(ج) عمدہ تعلیمی مرکز (د) اہم عبادت گاہ

(30) ہندستانی تاریخ کا سنہرا دور کسے کہا جاتا ہے؟

(الف) موریہ عہد (ب) چالوکیہ عہد

(ج) گپتا عہد (د) کشان عہد

(31) ہندستانی نپولین کس کو کہا جاتا ہے؟

(الف) سمدر گپت (ب) اسکند گپت

(ج) اشوک (د) چندر گپت

(32) گپت عہد میں ہندستان کے تجارتی تعلقات کس ملک سے قائم ہوئے؟

(الف) کمبوڈیا (ب) جاوا

(ج) برما (د) مذکورہ تمام

(33) مندرجۂ ذیل میں سے کس کو وکرمادتیہ کے نام سے جانا جاتا ہے؟

(الف) چندر گپت اوّل (ب) چندر گپت دوم

(ج) اسکند گپت (د) اشوک گپت

(34) گپت خاندان کا کون سا بادشاہ ماہر موسیقار تھا؟

(الف) چندر گپت اوّل (ب) سمدر گپت

(ج) چندر گپت دوم (د) اسکند گپت

(35) چرک کون تھا؟

(الف) شاعر (ب) سائنسداں

(ج) ادیب (د) طبیب

(36) چینی سیاح فاہیان ہندستان میں کس کے دور حکومت میں آیا؟

(الف) کنشک (ب) چندر گپت دوم

(ج) اشوک (د) چندر گپت اوّل

(37) ہرش وردھن کے دور حکومت میں کون سیاح ہندستان آیا؟

(الف) ہیون لی (ب) میگا ستھنیز

(ج) ہیون سانگ (د) فاہیان

(38) ہندستان پر مشہور تاریخی کتاب گیارھویں صدی میں کس غیر ملکی سیاح نے لکھی؟

(الف) البیرونی (ب) فردوسی

(ج) مسعودی (د) سلیمان

(39) ہندستان میں قرونِ وسطیٰ کا دور کس صدی سے شروع ہوتا ہے؟

(الف) چھٹی صدی (ب) ساتویں صدی

(ج) آٹھویں صدی (د) نویں صدی

(40) شاہ نامہ کا تخلیق کار ہے:

(الف) البیرونی (ب) فردوسی

(ج) ابن بطوطہ (د) عربی

(41) سلطنتِ غلامان کا اصلی بانی ہے:

(الف) قطب الدین ایبک (ب) رضیہ سلطان

(ج) التمش (د) بلبن

(42) پہلی مسلم عورت جس نے دہلی پر حکومت کی تھی؟

(الف) رضیہ سلطان (ب) چاند بی بی

(ج) جہاں آرا (د) نور جہاں

(43) رضیہ سلطان کس کی بیٹی تھی؟

(الف) قطب الدین ایبک (ب) التمش

(ج) بلبن (د) نصیر الدین

(44) التمش کس کا غلام تھا؟

(الف) قطب الدین ایبک کا (ب) بلبن کا

(ج) محمد غوری کا (د) ملک خسرو کا

(45) سلطنت خلجی کی بنیاد پڑی:

(الف) 1285 میں (ب) 1275 میں

(ج) 1290 میں (د) 1295 میں

(46) سلطنت خلجی کا بانی تھا:

(الف) جلال الدین (ب) علاء الدین

(ج) غیاث الدین (د) محمد

(47) ملک کافور کا نام جوڑا جاتا ہے:

(الف) سلطنتِ غلامان سے (ب) سلطنتِ خلجی سے

(ج) سلطنتِ سیدین سے (د) لودھی سلطنت سے

(48) علاء الدین خلجی نے 1294 میں فوجی مہم کہاں کے لیے روانہ کی؟

(الف) گجرات کے لیے (ب) میواڑ کے لیے

(ج) مالوہ کے لیے (د) دیوگیری کے لیے

(49) جنوبی ہندستان کا وہ کون سا حکمراں تھا جس نے 1303 میں علاء الدین خلجی کی فوج کو ہرایا؟

(الف) راجا کرن (ب) راجا رام چندرا

(ج) ملا دیوا (د) پرتاپ رودرا دوم

(50) چنگیز خاں نے کس کے دورِ حکومت میں ہندستان پر حملہ کیا۔

(الف) التمش (ب) بلبن

(ج) رضیہ بیگم (د) قطب الدین ایبک

(51) درج ذیل میں سے کس مورخ نے تغلق دورِ حکومت کے واقعات بیان کیے؟

(الف) البیرونی (ب) ضیاء الدین

(ج) حسن نظامی (د) ابن بطوطہ

(52) ''تاریخ فیروز شاہی'' کا خالق ہے:

(الف) ضیا برنی (ب) ابن بطوطہ

(ج) البیرونی (د) حسن نظامی

(53) فیروز شاہ تغلق کو کس بات کا خبط تھا:

(الف) گھوڑے کا (ب) مذہبی تعصب کا

(ج) آثار قدیمہ کا (د) غلام کا

(54) تیمور نے ہندستان پر کب حملہ کیا؟

(الف) 1396 (ب) 1398

(ج) 1498 (د) 1526

(55) وجے نگر سلطنت کی بنیاد کس نے رکھی؟

(الف) ہری ہر اور بکا (ب) کرشنا دیورائے

(ج) دیورائے (د) ان میں سے کوئی نہیں

(56) بہمنی سلطنت کا بانی تھا:

(الف) فیروز شاہ (ب) بہمنی شاہ

(ج) احمد شاہ (د) ہری ہر

(جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں)

D/o Abdul Rahim Karigar, H.No. 6-265,
Ghani Manzil, Khari Bowli, Mominpura,
Gulbarga (Karnataka)

□□□

محمد سہیم الدین

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو۔9

بڑھتے قدم

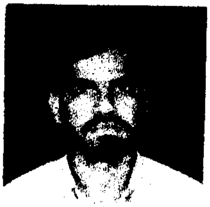

عبید احمد نے، جن کے والد کسان اور والدہ ہاؤس وائف ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے قصبہ خلیل آباد ضلع سنت کبیر نگر کے ایک مدرسے میں حاصل کی، اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے عالمیت کی۔ بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بی.اے آنرس عربک میں داخلہ لیا اور اسی دوران کونسل کے کمپیوٹر سینٹر الامین انفوٹیک سے کونسل کا ایک سالہ ڈپلوما اِن کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی. بھی مکمل کیا۔ آج اسی کورس کی وجہ سے قطر ایمبیسی میں کمپیوٹر آپریٹر کی حیثیت سے جاب کررہے ہیں۔ ان کا مختصر انٹرویو قارئینِ "اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: سچ پوچھیے تو بچپن میں ایک چھوٹے سے قصبے کا ہونے کی وجہ سے مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ کمپیوٹر کس چڑیا کا نام ہے لیکن وقت کے ساتھ حالات بھی بدلتے گئے اور ندوۃ العلما میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی مجھے جیسے جیسے اس سے واقفیت ہوتی گئی، دلچسپی بھی بڑھتی گئی۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: ان سینٹروں کی دیگر خصوصیات سے قطع نظر میرے لیے جو سب سے اہم خصوصیات ہیں وہ ان کے سافٹ ویئر پیکیجز اور اردو میں مہیا کیے گئے مواد ہیں جو اردو اور عربی داں طبقے کی ضروریات کو پوری کرتی ہیں اس کے علاوہ (الامین انفوٹیک) گورنمنٹ کی طرف سے دی جانے والی سرٹیفکیٹ کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے، اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: دوسرے سینٹروں کے بابت تو میں نہیں جانتا لیکن میرے سینٹر میں جو تربیت دی جارہی تھی اور جو طرزِ تعلیم تھا اس سے میں پوری طرح مطمئن تھا۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اُردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: اس دور میں ہر وہ ادارہ جو خود سے وابستہ افراد کو انفارمیشن ٹیکنالوجی سے جوڑ رہا ہے وہ بہرصورت روزگار فراہم کرانے میں بھی معاون ہے اور یہی حال اردو کونسل کا اردو جاننے والوں کے ساتھ ہے جس کی زندہ مثال میں خود ہوں۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: مجھے لگ رہا ہے کہ میں اس شعر پر عمل کر رہا ہوں ؎

چلتے ہیں ناشناس زمانے کے ساتھ ساتھ
تم اس طرح چلو کہ زمانہ ہو تیرے ساتھ

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: خود اعتمادی اور خود انحصاری دونوں میں اضافہ ہوا ہے اور سب سے بڑا بدلاؤ یہ ہے کہ کل تک میں بے روزگار تھا اور آج اس کی وجہ سے ایک اچھی جگہ نوکری کر رہا ہوں۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: ایک ایسے مقام پر جہاں بہت کم لوگ پہنچ پاتے ہیں۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: جی نہیں، فیس مناسب ہے کیونکہ دوسری جگہوں پر بھی فیس کم نہیں ہے۔

□□□

اردو خبرنامہ

انیس اور دبیر پر سمینار

● نئی دہلی۔ گذشتہ 21 اور 22 فروری 2004 کو ساہتیہ اکادمی کے زیرِ اہتمام انیس اور دبیر کے دوسو سالہ سال پیدائش کے موقعے پر سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں ملک و بیرون ملک کے ماہرین نے شرکت کی، افتتاحی اجلاس کی صدارت ممتاز نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ انیس اور دبیر ہماری شاعری کی اس وقیع روایت کا حصہ ہیں جن کے بغیر اردو شاعری کی کوئی تصویر مکمل نہیں سمجھی جاسکتی۔ دبیر ہماری تاریخ میں بوجوہ پسِ پشت چلے گئے اور انیس پیش نگاہ رہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دبیر کو بھی ان کا جائز مقام دیا جائے اور دونوں ماہرین فن کا نیا تنقیدی جائزہ اس تہذیبی تناظر میں لیا جائے جو ایران و عرب سے الگ ہماری اپنی گنگا جمنی تہذیب کا ہے۔

اس موقعے پر ٹورنٹو سے آئے ہوئے ماہر انیسیات و دبیریات ڈاکٹر سید تقی عابدی نے سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ دبیر اور انیس کے متن سے ابھی تک انصاف نہیں کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ مرزا دبیر اور انیس کی آج اس لیے ضرورت ہے کہ ان دو استاد شعرا کے کلام میں وہ تمام توانائی موجود ہے جس سے پوری انسانیت کی تعمیر ہوسکتی ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے "مراثی انیس کا استعاراتی نظام" کے عنوان سے اپنا کلیدی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر آزرمیدخت نے کہا کہ لفظوں کے انتخاب میں انیس اور دبیر کا کوئی ثانی نہیں۔ افتتاحی اجلاس کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری پروفیسر کے سچدانندن نے رثائی ادب کی روایت کا بھرپور جائزہ پیش کیا اور تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور مشاورتی بورڈ کے کنوینر شمیم کاف نظام نے آخر میں تمام مہمانوں، مقالہ نگاروں اور مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔

سمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر قمر رئیس نے کی۔ اس اجلاس میں رضا علی عابدی نے "ہم انیسیے بھی ہیں اور دبیریے بھی"، صابر ارشاد عثمانی نے "انیس کے ہم عصر شاعر رومانی دور میں" اور عباس رضا نیر نے "اسٹیج، مکالمہ اور دبیر" پیش کیا۔ سمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شارب ردولوی نے کی۔ اس میں ممتاز ناقد انیس اشفاق نے "مراثی انیس میں دریا کے رنگ"، شمیم طارق نے "مراثی انیس میں رجز"، محمد زماں آزردہ نے "مرزا دبیر کے امتیازات" اور قمر جہاں نے "مراثی دبیر میں رزمیہ عناصر" کے عنوان سے اپنے مقالے پیش کیے۔

سمینار کے دوسرے دن تیسرے اجلاس کی صدارت رضا علی عابدی نے کی۔ اس موقعے پر پاکستان سے آئے ممتاز ادیب پروفیسر مشکور حسین یاد نے کہا کہ میر انیس اردو مرثیے کے امام ہیں تو مرزا دبیر جدید اردو مرثیے کے پیش رو اور ہم ان دونوں مرثیہ نگاروں کی خدمات اور ان کی قادرالکلامی کا اعتراف کرتے ہیں۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے مضمون "مراثی دبیر میں مضمون آفرینی کا عمل" میں کہا کہ دبیر کے مرثیوں میں ان کی صناعی بھی ہے تخیل کی بلند پروازی بھی، استعاروں اور تراکیب کا التزام بھی اور معنی آفرینی و مضمون آفرینی بھی۔ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے "میر انیس کی

"میں نے بھی مدرسے میں تعلیم حاصل کی ہے": صدرِ جمہوریہ

● مونگیر۔ صدر جمہوریہ ہند عالی جناب ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام نے کہا ہے کہ قرآن مقدس کی پہلی سورۃ "الفاتحہ" کو آئیڈیل مانتے ہوئے انھوں نے اپنی عملی زندگی کی شروعات کی اور انھیں اپنی زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں قرآن مقدس ان کا رہنما اور راہبر رہا۔ صدر جمہوریہ ہند گذشتہ دنوں مونگیر تشریف لائے۔ اس موقعے پر انھوں نے شمالی ہند کے ممتاز روحانی اور دینی تعلیم کے مرکز خانقاہ رحمانی جامعہ رحمانی میں بانی خانقاہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اور مولانا سید منت اللہ رحمانی کی قبروں پر فاتحہ خوانی کی اور سجادہ نشیں مولانا محمد ولی رحمانی سے ملاقات کر کے خانقاہ رحمانی کی روحانی عظمت اور جامعہ رحمانی کے معیار تعلیم سے متعلق جملہ امور پر تبادلۂ خیال بھی کیا۔ انھوں نے تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق جانکاری حاصل کی اور ملک و قوم کے لیے گرانقدر خدمات انجام دینے کی خاطر قرآن مقدس کا مطالعہ کرنے اور وسیع تر انسانیت کی بقا کے لیے میدان عمل میں آنے کا مشورہ دیا۔

اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ جنگ آزادی اور آزادی کے بعد قومی یکجہتی کے فروغ اور بقائے انسانی کی خاطر اس ادارے نے کلیدی کردار نبھائے ہیں۔ ملک کی سالمیت اور استحکام کو بنائے رکھنے میں یہ ادارہ فعال کردار نبھانے میں لگا رہا ہے۔ صدر جمہوریہ نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نوجوان لوگ ہیں، آپ کو یہ سمجھنا ہے کہ سچائی کے فروغ اور ملک کی سلامتی کی خاطر آپ کا کیا رول ہونا چاہیے۔ ایک مستحکم اور مضبوط ملک کی بقا کے لیے جو ذمے داری آپ پر عائد ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ حق گوئی کو اپنا شعار بنائیں اور قرآن مجید کی پہلی سورۃ کا مطالعہ کریں۔

انھوں نے طلبہ سے کہا کہ آپ ملک کے مستقبل کے معمار ہیں، آپ جدوجہد سے بھری زندگی گزاریے، وقت کی پابندی کیجیے، میں نے بھی مدرسے میں تعلیم حاصل کی ہے۔ آزادانہ طور پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں صبح سویرے بیدار ہوتا تھا اور وقت پر مدرسہ چلا جاتا تھا۔ آپ بھی سویرے بیدار ہوں اور کلاس روم وقت پر پہنچیے۔ کتب خانہ رحمانیہ میں جامعہ رحمانی کے بچوں سے صدر موصوف نے بڑی خندہ پیشانی سے ملاقات کی۔ قبل ازیں مولانا سید محمد ولی رحمانی نے انتہائی مختصر مگر جامع الفاظ میں صدر موصوف کا شہر مونگیر اور خانقاہ رحمانی کی مقدس سرزمین پر استقبال کیا اور مونگیر کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ (ڈاک سے)

ارضیت (تلازمات دام و دور کی روشنی میں)'' اور اقبال مرزا نے اپنا مقالہ بعنوان ''میر انیس اور شیکسپیئر کے کلام میں مماثلت'' پیش کیا۔ بعد میں سوال و جواب میں آزرمیدُخت، سید تقی عابدی، ایم۔آر۔ قاسمی، ڈاکٹر مولا بخش، انیس اشفاق، قمر جہاں وغیرہ نے حصہ لیا۔

سمینار کے آخری اور چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد زماں آزردہ نے کی۔ اس اجلاس میں شین کاف نظام نے ''مرثیہ، انیس اور ثقافت'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ انیس کے مرثیوں میں حسین حق کے طرفدار، نسلی وصلیبی حکومت کے مخالف اور اقدار کے جاں نثار نظر آتے ہیں۔ سید محمود نقوی نے اپنے مقالے ''دبیر فہمی کی ایک سعی ناتمام'' میں مرزا دبیر کے ایک مرثیہ 'جب ختم کیا سورۂ واللیل قمر نے' کے استعاراتی نظام کا جائزہ لیا۔ اس موقع پر عبدالسنان طرزی نے 'ناطقے بند جو کر دے وہ بلاغت اس کی' کے عنوان سے 65 اشعار پر مبنی ایک خوبصورت نظم پیش کی۔ حسن مثنیٰ نے ''مراثی انیس میں رزمیہ عناصر''، عزیز حیدر نے ''میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے پر ایک نظر (شیکسپیئر کے تناظر میں)''، عابد حیدری نے ''اردو مرثیے میں ماورائی عناصر فضا'' اور ضیاء الدین اصلاحی نے ''دبیر کے مرثیوں کے نمایاں پہلو'' کے عنوانات سے مقالے پیش کیے۔ سمینار کے اختتامیہ پر ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے تمام مہمانوں، مندوبین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ دبیر شناسی کی جانب اردو تنقید کا حالیہ سفر یہ ثابت کرتا ہے کہ تنقید کی کوتاہیوں کو دور بھی تنقید ہی کرتی ہے، کوئی دوسرا نہیں۔ (عالمی سہارا، نئی دہلی)

''معاصر ادب میں احتجاج اور مزاحمت کے رویے''
سہ روزہ سمینار

● نئی دہلی، 13 رفروری۔ اردو اکادمی کی جانب سے سہ روزہ کل ہند سمینار بعنوان 'معاصر ادب میں احتجاج اور مزاحمت کے رویے'' کا افتتاحی اجلاس راجندر بھون میں منعقد کیا گیا۔ اس کی صدارت پروفیسر قمر رئیس اور نظامت انیس اعظمی نے کی۔ ڈاکٹر بیگ احساس، ڈاکٹر غضنفر، خورشید سمیع، ڈاکٹر سراج اجملی، عزیز پریہار، مرغوب حیدر عابدی، بلراج کومل، متین امروہوی، شعیب مرزا، ڈاکٹر عقیل، ظہیر برنی، نرمل سنگھ نرمل، ڈاکٹر تابش مہدی، انجم عثمانی، معین شاداب، مودود صدیقی و دیگر علمی و ادبی شخصیات بھی اہم شرکا میں شامل تھیں۔ اکادمی کے وائس چیئرمین م۔افضل نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے سمینار کے موضوع ''معاصر ادب میں احتجاج اور مزاحمت کے رویے'' پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر قمر رئیس نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہیجانی اور جذباتی ادب کے برعکس اخلاقی اقدار پر مشتمل ادب دیرپا اور آئندہ نسلوں تک منتقل ہونے کی صلاحیت سے معمور ہوتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ادب میں اخلاقی اور انحرافی عمل لسانی نشوونما کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ آخر میں یو۔این۔آئی کے شیخ منظور احمد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

سمینار کے پہلے اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر صادق، بلراج کومل، فیضی عزیز ہاشمی شامل تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں جن مقالہ نگاروں نے شرکت کی ان کے نام اور موضوعات اس طرح ہیں۔ پروفیسر محمد حسن (معاصر ادب میں احتجاج اور مزاحمت) پروفیسر ابوالکلام قاسمی (احتجاجی ادب کا مسئلہ) ڈاکٹر بیگ احساس (جوش ملیح آبادی) ڈاکٹر خورشید سمیع (اردو نظم 1940 سے 1960) عزیز پریہار (دلت ادب میں احتجاج اور مزاحمت کی آواز) اور ڈاکٹر امام اعظم (اردو غزل 1960 تا 1980)۔ آخر میں مجلس صدارت کی نمائندگی کرتے ہوئے پروفیسر صادق نے پڑھے گئے تمام مقالات کا جائزہ لیا۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

اردو ریفریشر کورس

● جے پور۔ جدید تحقیق، تازہ معلومات اور نئے تعلیمی وسائل سے یونیورسٹی اور کالج اساتذہ کو متعارف کرانا اور مفید مباحث کو فروغ دینا یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی کارکردگی کا بنیادی حصہ ہے۔ اسی مقصد کے تحت صوبۂ راجستھان میں پہلی بار اردو ریفریشر کورس کا انعقاد راجستھان یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی اور اکیڈمک اسٹاف کالج کی طرف سے مشترکہ طور پر کیا گیا۔ کورس کا مرکزی موضوع ''جدید اردو نظم کے رجحانات'' تھا۔ پروفیسر فیروز احمد صدر شعبۂ اردو و فارسی کورس کے کوآرڈینیٹر اور ڈاکٹر سید مدبر علی زیدی معاون کوآرڈینیٹر تھے۔

اس میں ممبئی، بھوپال اور اندور کے علاوہ جے پور، ٹونک، اجمیر، کوٹہ اور اودے پور کے کالج اور یونیورسٹی کے اردو اساتذہ نے شرکت کی۔ کورس کے دوران ہر روز ملک کے نامور شرکا نے اپنے لیکچرس اور مباحث کے ذریعے جدید اردو نظم کے متنوع پہلوؤں کا علمی احاطہ کیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے افتتاحی اجلاس کے صدارتی خطبے میں کہا کہ غزل کے لیے Urban Sensiblity کی ضرورت ہے جسے مشرقی اشرافیہ کا بہترین طرز احساس کہا جا سکتا ہے۔ نظم وہ صنف ہے جس میں ہر طرح کے طرز احساس کی گنجائش ہے اور اسی وجہ سے نظم کی اہمیت ہے۔ پروفیسر قاضی افضال حسین نے اردو نظم کی تنقید کے جدید ترین رجحانات پر گفتگو کرتے ہوئے نظم کی تفہیم میں لسانیاتی، ساختیاتی اور رد تشکیلی عناصر کی افادیت پر زور دیا۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے جدید نظم کے دو اہم فنکاروں مجید امجد اور بلراج کومل کے فن سے بحث کی۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے جنوبی ہند کے جدید شعری ادب، پروفیسر عبدالحق نے اقبال اور جدید نظم، پروفیسر شریف الحسن قاسمی نے جدید فارسی نظم اور

جناب سہیل احمد فاروقی نے سردار جعفری کی نظم نگاری کا جائزہ لیا۔ پروفیسر فیروز احمد نے اپنے مختلف لیکچرس میں انتہائی اہم تحقیقی نکات کی وضاحت کی۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ نظم جدید کے بانیوں میں ہم مولانا حالی کا نام سب سے پہلے لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد حسین آزاد نے نظم جدید کا تصور سب سے پہلے پیش کیا اور انجمنِ پنجاب کے مشاعروں میں اس کا عملی پہلو سامنے آیا۔ انھوں نے آزادی سے قبل راجستھان میں اردو نظم کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی۔

کورس کے دوران ڈاکٹر سید مدبر علی زیدی، ڈاکٹر روشن اختر کاظمی، ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی اور جناب احتشام اختر نے بحیثیم باحثے میں حصہ لیا۔ اس دوران دیگر زبانوں کی جدید نظم کے رجحانات پر بھی گفتگو کی گئی۔ راجستھان یونیورسٹی میں انگریزی کی پروفیسر جسبیر جین نے مابعد جدید انگریزی نظم کا تعارف پیش کیا۔ جرمن زبان کے استاد ڈاکٹر راجیندر پدترے نے نظم کے تراجم سے متعلق پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر آشا پانڈے نے فرنچ نظموں میں علامت نگاری کی تحریک کا جائزہ لیا اور ڈاکٹر رودی شری واستو نے ہندی نظم پر گفتگو کی۔

ریفریشر کورس کے دوران ''ترسیل و ابلاغ'' کے زیرِ عنوان ایک مذاکرہ بھی منعقد کیا گیا جس کے شرکا کا خیال تھا کہ جدیدیت کے ابہام نے نظم کو ناقابلِ تفہیم بنا دیا۔ اس موقعے پر شرکا نے میراجی کی نظموں کو ناقابلِ فہم قرار دیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ارشد عبدالحمید نے کہا کہ ادب میں ابلاغ کا مسئلہ قاری کی ذہنی، سماجی، علمی اور ترجیحی دلچسپیوں سے ہم رشتہ ہے۔ چونکہ ہم سب اردو ادب کے استاد ہیں اس لیے ابلاغ کے مسئلے پر ہمیں ابہام کی آڑ نہیں لینی چاہیے۔ میراجی کچھ لوگوں کے لیے مشکل ہو سکتے ہیں لیکن اگر وہ سبھی کے لیے ناقابلِ فہم ہیں تو ہماری تربیت اور ذہنی معیار میں یقیناً کچھ کمی ہے۔ مذاکرے کے صدارتی خطبے میں قاضی جمال حسین نے کہا کہ ہم زبان کو جتنا Aquire کریں گے، ترسیل اتنی ہی آسان ہوگی۔ ادب اعلا ترین ذہن کی اعلا ترین کارکردگی ہے اور یہی کارکردگی ہمارے مطالعے کا مرکز ہے اگر ہم اس مطالعے سے جی چرائیں گے تو شاعری کیا نثر بھی ہمیں مشکل معلوم ہوگی، لہٰذا مطالعے کی وسعت بنیادی ضرورت ہے۔

سیمینار کا موضوع تھا ''جنگِ آزادی میں اردو کا حصہ۔'' اس میں ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیازی، ڈاکٹر قائد علی، ڈاکٹر حسن آرا، ڈاکٹر ظفر رضا، ڈاکٹر سید صادق علی، ڈاکٹر ثریا خانم، ڈاکٹر قمر جہاں اور دیگر شرکا نے اپنے مقالات پڑھے۔ ڈاکٹر ارشد عبدالحمید نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور پروفیسر فیروز احمد نے صدارت کی۔ (ڈاک سے)

''غالب کی شعری تراکیب'' پر ورکشاپ

● نئی دہلی، 12 رفروری۔ اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر لکھنؤ اور شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے ''غالب کی شعری تراکیب'' پر منعقدہ ہفت روزہ ورکشاپ کا افتتاحی اجلاس پروفیسر اختر الواسع کی صدارت میں خیابانِ اجمل میں منعقد ہوا جس میں کلیدی خطبہ پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے پیش کیا اور افتتاح پروفیسر شمیم حنفی نے کیا۔ ڈاکٹر خالد محمود نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ ورکشاپ کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ زبان کے امکانات شاعری کے وسیلے سے انتہائی بلندیوں تک پہنچتے ہیں اور ترکیبیں شاعری کی قوت ایجاد کا پتہ دیتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک تجربے سے دوسرے تجربے تک پہنچانے کا ذریعہ تراکیب ہیں جس کا بہت زیادہ استعمال کلام غالب میں ملتا ہے، غالباً اسی وجہ سے غالب ہر زمانے کے لیے چیلنج بنے رہے ہیں۔ اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر کے پرنسپل ڈاکٹر غضنفر علی نے ورکشاپ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے کہا کہ غالب کی مقبولیت ہر عہد میں رہی ہے اور ان کے کلام کو اردو زبان و ادب میں آج بھی بنیادی سرچشمے کی حیثیت حاصل ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ غالب کو انگریزی دنیا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ہی روشناس کرایا ہے اور یہ ورکشاپ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے کیوں کہ اب تفہیم کی سطح پہلے کی بہ نسبت گرتی جا رہی ہے۔ غالب اور ہمارے زمانے کے تہذیبی رویوں میں خاصا بعد پیدا ہو چکا ہے، ایسے ماحول میں یہ کوشش ایک نہایت مستحسن قدم ہے۔

ورکشاپ کا اختتامی اجلاس صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں پروفیسر ظہور الدین، جموں یونیورسٹی نے بحیثیت مہمانِ خصوصی شرکت کی۔

پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کہا کہ کلاسکی شعرا پر مختلف جہات سے کام ہو رہا ہے مگر اپنے آپ میں یہ بالکل نیا اور انوکھا کام ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس سے غالبیات کے مطالعے میں دلچسپی بھی پیدا ہوگی اور اردو شعر و ادب سے رغبت بھی۔ پروفیسر ظہور الدین نے کہا کہ غالب کی شعری تراکیب میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے جس کی عقدہ کشائی عام لوگوں کے لیے مشکل ہے۔ اس ورکشاپ سے یہ مرحلہ آسان ہو جائے گا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ شاعری میں لفظ بہت اہم ہوتے ہیں۔ انسانوں کی طرح لفظ بھی سفر کرتے ہیں اور محل وقوع کے ساتھ ساتھ ان کے معنی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے یہ ورکشاپ ایک مشکل کام کی پہلی منزل ہے۔ اختتامی اجلاس سے پروفیسر عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر غضنفر علی اور جناب عبدالرشید نے بھی خطاب کیا۔ ورکشاپ کے مقامی کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر شہپر رسول نے اختتامی جلسے کی نظامت کی اور ڈاکٹر خالد محمود نے شرکا اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

یومِ غالب کا انعقاد

● نئی دہلی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ اور انجمن ترقی اردو، ہند (دہلی شاخ) کے

زیرِ اہتمام غالب کی یومِ وفات پر یومِ غالب کا انعقاد کیا گیا جس میں مزارِ غالب پر گل افشانی، فاتحہ خوانی، تقاریر، شامِ غزل اور منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی نے کہا کہ مزارِ غالب پر غالب کی یاد اُس وقت سے منائی جارہی ہے جب دلّی میں نہ کوئی ادبی ادارہ تھا نہ اردو ادب کے نام پر کوئی سرگرمی ہوتی تھی اور اسی یومِ غالب کی وجہ سے ہماری ادبی سرگرمیوں میں ایک نئی جان آئی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اس طرح کے جلسے منعقد ہوتے رہیں کیوں کہ غالب کی شاعری کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے میں اس طرح کے جلسے بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنی تقریر میں غالب اور الہٰ آباد کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ غالب پر تحقیق و تنقید کا سلسلہ صرف اردو دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں میں بھی تفہیمِ غالب کا چلن عام ہے۔ صدرِ جلسہ جناب خواجہ حسن ثانی نظامی نے غالب کی زندگی کے حوالے سے چند نئے نکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ غالب کی زندگی اور شاعری کو ہمیں تصوف کے حوالے سے بھی سمجھنا چاہیے۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے بھی جلسے میں خطاب کیا۔ جلسے کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر رضا حیدر نے انجام دیا۔ یومِ غالب کا اختتام غالب کی زمین میں منظوم خراجِ عقیدت سے ہوا جس میں ملک کے ممتاز شعرا نے شرکت کی۔ اس شعری نشست کی صدارت جناب رفعت سروش نے کی اور نظامت کا فریضہ جناب معین شاداب نے انجام دیا۔ جن شعرا نے شرکت کی اُن میں جناب مظہر امام، جناب زبیر رضوی، جناب گلزار دہلوی، جناب وقار مانوی، محترمہ نور جہاں ثروت، جناب شکیل شمسی، جناب متین امروہوی، جناب واجد سحری، جناب ابرار کرتپوری، ڈاکٹر اسلم پرویز، جناب مخدوم زادہ مختار عثمانی، جناب شہباز ندیم ضیائی، جناب معین شاداب، جناب شاداب بھٹناگر، جناب سراج اجملی، جناب احمد محفوظ، جناب راہی شہابی، جناب ملک زادہ جاوید، جناب ایم آر قاسمی اور جناب شاہد ماہلی قابلِ ذکر تھے۔ (ڈاک سے)

طوسی اور علومِ انسانی پر دو روزہ مذاکرہ

● نئی دہلی، 26 رفروری۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں نصیر الدین طوسی و علوم انسانی پر دو روزہ سمینار کا افتتاح عمل میں آیا۔ یہ سمینار ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی نے یونیسکو اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے باہمی تعاون سے منعقد کیا۔ سمینار کی صدارت جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر جی کے چڈھا نے کی۔ یونیسکو کے ڈائرکٹر جناب محسن توفیق اس موقعے پر مہمانِ خصوصی تھے۔

ایران کلچر ہاؤس کے ڈائرکٹر جلال نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ انسانی تاریخ پر اس بزرگ فلسفی کا احسان ہے جو اپنے دور کا بہت بڑا ریاضی داں، سائنس داں، ماہرِ علم طب و نجوم اور فارسی کا ایک بڑا شاعر تھا۔ ڈاکٹر جی کے چڈھا نے کہا کہ نصیر الدین طوسی جیسی عالمانہ شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ آج جبکہ زمانہ تحقیق کی نئی نئی راہیں تلاش کررہا ہے نصیر الدین طوسی جیسے محقق نے علمِ ریاضیات اور سائنسی علوم پر کام کیا ہے۔ جناب محسن توفیق نے کہا کہ یونیسکو عالمی طور پر ثقافتی میراثوں کو تحفظ فراہم کرنے میں کوشاں ہے۔

اس موقعے پر جامعہ ہمدرد کے پروفیسر سید اوصاف علی نے مسلم فلسفیوں کا جائزہ لیتے ہوئے علوم کے فروغ میں طوسی کی عالمانہ خدمات پر روشنی ڈالی۔

24 رفروری کو ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی میں مقالہ خوانی کی نشستیں منعقد ہوئیں جس میں پروفیسر ہادے والا، پروفیسر اقتدار حسین صدیقی، ڈاکٹر عطا کریم بخش، ڈاکٹر ظفر عالم، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر عزیز الدین حسین، ڈاکٹر علیم اشرف خاں، ڈاکٹر کمال الدین ہمدانی، ڈاکٹر نرگس جعفری ایرانی، ڈاکٹر علاء الدین شاہ، ڈاکٹر خلیلی ایرانی نے مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر دہلی کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ دہلی کی سرکردہ شخصیتوں نے شرکت کی۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

مذاکرہ ''تحریکِ آزادی میں اردو کا کردار''

● عثمان آباد۔ 21 رفروری کو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی اور ضلع پریشد عثمان آباد کے محکمۂ تعلیمات کے زیرِ اہتمام وائی. بی چوان سبھا گرہ میں تحریکِ آزادی میں اردو کا کردار کے موضوع پر ممتاز صحافی، ادیب اور شاعر حامد اکمل کی صدارت میں ایک سمینار منعقد ہوا۔ جناب فہیم احمد صدیقی نے تحریک آزادی میں اردو شاعری کا حصہ اور ڈاکٹر حشمت نے مجاہدینِ آزادی کے اردو خطوط کے زیرِ عنوان تحقیقی مقالے پیش کیے۔ سمینار کے آغاز میں مولوی عبد العزیز نداف نے بسمل کی مشہور غزل ''سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے'' ترنم سے سنا کر تحریکِ آزادی کی یاد تازہ کی۔ جناب وقار احمد شیخ (کنوینر ورکن اکادمی) نے سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ مولوی سعید قاضی نے خیر مقدم کیا۔ مسٹر انیل مورے نے شمع جلا کر سمینار کا افتتاح کیا اور اپنی تقریر میں زبانِ محبت اردو کے فروغ و تحفظ پر زور دیا۔ محترمہ شہناز اوسے کرنے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ آخر میں مسٹر پردیپ مورے (ایجوکیشن آفیسر) نے تحریکِ آزادی پر سمینار کے انعقاد کے ذریعے اردو کے تاریخی انقلابی کردار کو واضح کرنے پر مہاراشٹر اردو اکادمی اور کنوینر جناب وقار شیخ کو مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر مثالی اردو معلم کا ایوارڈ حاصل کرنے پر معز الدین رضوی کو تہنیت بھی پیش کی گئی۔ آخر میں جناب سعید قاضی نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

جامعہ ہمدرد کو اقلیتی ادارے کا درجہ

● نئی دہلی، 7 رفروری۔ طب یونانی کی تعلیم کے لیے مشہور ادارہ جامعہ ہمدرد کے قیام کے 20 سال بعد مرکزی حکومت نے اسے اقلیتی ادارے کا درجہ دے دیا۔ وزارت فروغ انسانی وسائل نے یونیورسٹی کو مطلع کیا کہ مرکزی حکومت نے آئین کی دفعہ 30 (1) کے تحت اس ادارے کو اقلیتی ادارے کی حیثیت سے تسلیم کرلیا ہے۔ جامعہ ہمدرد کے رجسٹرار نے بتایا کہ وزارت نے مسلمانوں کے لیے 50 فیصد ریزرویشن کی یونیورسٹی کی پالیسی کو بھی منظور کرلیا ہے اور یونیورسٹی کو داخلوں کے لیے اپنے طریقِ کار پر عمل کرنے کی بھی اجازت دے دی ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ڈاکٹر امتیاز احمد خدابخش لائبریری کے نئے ڈائرکٹر

● پٹنہ، 8 رفروری۔ خدابخش لائبریری کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری یکم فروری 2004 کو لائبریری کی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ ان کی جگہ ڈاکٹر امتیاز احمد (ریڈر شعبۂ تاریخ، پٹنہ یونیورسٹی) نے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالا ہے۔

اس موقعے پر لائبریری کے ملازمین کی جانب سے 7 رفروری کی شام منعقدہ الوداعیہ تقریب میں ڈاکٹر امتیاز احمد نے ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری کی نمایاں خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے سہ سالہ عہد کو ایک زرّیں عہد قرار دیتے ہوئے کہا کہ آپ نے اپنی ذمے داریاں بحسن وخوبی انجام دیں، کچھ نئے کام کی آپ نے داغ بیل ڈالی بالخصوص Retro-Conversion اور مخطوطات پر مینو اسکرپٹ مشن کا کام آپ کے عہد میں شروع ہوا۔ ہمارے لیے ان کی جانب سے بہتر تحفہ یہ ہوگا کہ جو کام وہ چھوڑ کر جارہے ہیں اسے احسن طریقے سے ہم انجام دیں۔

جناب شفیع مشہدی صاحب نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ انصاری صاحب نے زندگی کا بڑا حصہ لائبریری کو دیا ہے ایسے صاحب علم کی فرقت گراں گزرتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم الدین احمد، اسسٹنٹ ڈائرکٹر خدابخش لائبریری نے کہا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری نے اپنی مدت کار میں لائبریری کو کافی فروغ دیا اور بہت ساری نئی چیزوں کی بنیاد ڈالی۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری نے اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے جتنا بھی موقع مل سکا اس عظیم لائبریری کی میں نے خدمت کی۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جسے اس لائبریری کی خدمت کا موقع ملے، جسے لائبریری اسٹاف کا تعاون ملے، اور جسے شہر کے لوگوں کی محبت اور شفقت ملے۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایک ایسا جانشیں چھوڑ کر جارہا ہوں جس کے دور میں لائبریری زیادہ ترقی کرے گی۔

(ڈاک سے)

دہلی اردو اکادمی کے ایوارڈ

● نئی دہلی، 17 رفروری۔ اردو اکادمی، دہلی نے قومی سطح کا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ پہلی مرتبہ ایک ممتاز صحافی اور روزنامہ ''قومی آواز'' کے سابق چیف ایڈیٹر عشرت علی صدیقی کو دیا ہے۔ یہ ایوارڈ ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپے نقد اور ایک توصیفی سند پر مشتمل ہے۔

اکادمی کی ایک ریلیز کے مطابق سال 2003 کے لیے ان کے علاوہ ایوارڈ برائے تحقیق وتنقید پروفیسر عتیق اللہ، ایوارڈ برائے تخلیقی ادب (دو ایوارڈ)، عظیم اختر اور حقانی القاسمی، ایوارڈ برائے شاعری، چندر بھان خیال، ایوارڈ برائے صحافت سعید سہروردی، ایوارڈ برائے لسانی یکجہتی ارن کمار اور ایوارڈ برائے قومی یکجہتی سے محترمہ سیدہ سیدین کو دیے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں عارف عثمانی کو ایوارڈ برائے بہترین استاد، محترمہ وسیم راشد کو ایوارڈ برائے بہترین استانی، عبدالرحمان کو ایوارڈ برائے سائنسی ادب، مولانا محمد یوسف کو ایوارڈ برائے خطاطی، مولانا اظہر ندوی کو ایوارڈ برائے ترجمہ، جے این کوشل کو ایوارڈ برائے اردو ڈرامہ اور تنویر احمد کو ایوارڈ برائے بچوں کا ادب بھی دیے گئے ہیں۔ یہ چودہ ایوارڈ فی کس 21 ہزار روپے نقد اور ایک توصیفی سند پر مشتمل ہیں۔

اس سے قبل سال 2003 کے لیے کتابوں پر انعامات دیے جاچکے ہیں۔

جن کتابوں کو مبلغ اکیاون سو روپے کے انعام دیے گئے وہ ہیں:

قلم آشنا (ڈاکٹر جی آر کنول)، جدید اردو افسانوں میں احتجاج کی بازگشت (ڈاکٹر احمد صغیر)، پھول آنگن کے (قمر سنبھلی)، خانوادہ نور (رفعت سروش)، بلونت سنگھ فن وشخصیت (ممتاز آرا)، مطالعہ ہندستان (بشیر احمد)، اودھ کے فارسی گوشعرا (ڈاکٹر زہرہ فاروقی)، الکٹرانک میڈیا میں ابھرتے رجحانات (ڈاکٹر طارق اقبال صدیقی)، ہرچرن چاولہ: فن اور شخصیت (ڈاکٹر نگار عظیم)، داستان سے ناول تک (ڈاکٹر ابن کنول)، کتاب السموم (محمد جنید صدیقی)، ہم راز (ایس کے گوئل راز)، تاریخ مشائخ قادریہ (ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم)، شوخیِ قلم (اسد رضا)، سلسلہ (طالب زیدی)، پانچ بہنیں (سعید النسا بیگم)، مسند فقر وارشاد (ڈاکٹر سید ظہیر حسین جعفری) اور غنچہ پھر لگا کھلنے (حلیمہ سعدیہ شگفتہ)۔

مندرجۂ ذیل کتابوں کو مبلغ پینتیس سو روپے کے انعام سے نوازا گیا:

اردو ادب اطفال میں خواتین کا حصہ (ڈاکٹر خوشحال زیدی)، بھینی بھینی مہک (ظفر عدیم)، شیر مال (راز صابری)، جستجو وگفتگو (ڈاکٹر وہاج الدین علوی)، راہ مودت (رہبر جارچوی)، جانور ہمارے رہنما (خسرو متین)، معصوم (تحسین منور)، طنابیں دھوپ کی (پی پی سریواستو رند)۔

نیز تخلیق کار پبلشرز اور کتاب والا کو منشی نول کشور انعام برائے ناشر کو دیا گیا ہے۔ یہ انعام مبلغ اکیاون سو روپے پر مبنی ہے۔ **(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)**

مختصرات

● گلبرگہ، 12 رفروری۔ قومی اردو کونسل کی طرف سے حلیمہ ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ میں چلائے جارہے کمپیوٹر سینٹر کے طلبہ و طالبات کے لیے کونسل کے نصاب اردو سے متعلق ڈاکٹر خالد سعید صدر شعبۂ اردو، کرناٹک کالج، بیدر کا ایک توسیعی لکچر رکھا گیا جس میں کمپیوٹر سینٹر میں زیرِ تعلیم تمام طلبہ و طالبات شریک ہوئے۔ کمپیوٹر کے نصاب اردو کی ستائش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ نصاب موجودہ اردو زبان و ادب میں ایک نئی جان پیدا کرتا ہے۔ یہ نصاب اردو زبان و ادب کی بقا اور اس کی ترویج و ترقی میں بڑا معاون ثابت ہوگا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی اردو زبان و ادب کے لیے اور نوجوانوں میں مسابقتی جذبہ پیدا کرنے کے شب و روز کی محنتیں لائق ستائش ہیں۔ جناب سید علیم اللہ حسینی نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ جناب امجد جاوید چیف ٹرسٹی نے صدارت فرمائی اور جناب سید سمیع اللہ حسینی سپروائزر نے اظہارِ تشکر کیا۔
(ڈاک سے)

● بنگلور، 13 رفروری۔ کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور کی جانب سے منعقدہ تحریری، تقریری اور ادبی کوئز مقابلوں میں حلیمہ ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ کے طلبہ و طالبات نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے انعامات حاصل کیے۔ تحریری مقابلے میں نور فاطمہ کو اول انعام اور حسن محمود کو دوم انعام حاصل ہوا۔ ادبی کوئز میں نور فاطمہ، اسما فردوس، محمد منور کو دوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ محمد اسماعیل کو بہتر انداز بیان پر ترغیبی انعام سے نوازا گیا۔ صدر اکادمی جناب وہاب عندلیب نے طالب علموں کو انعامات سے نوازا۔ جناب امجد جاوید چیف ٹرسٹی حلیمہ ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ نے اساتذہ اور طلبہ و طالبات کو اس موقعے پر مبارک باد پیش کی۔ (ڈاک سے)

● پٹنہ، 29 رجنوری۔ اردو کے ممتاز شاعر کرشن موہن کے سانحۂ ارتحال پر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم آزاد کی صدارت میں ایک تعزیتی نشست منعقد کی گئی جس میں ڈاکٹر اسرائیل رضا، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اور ڈاکٹر صفدر امام قادری نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ پروفیسر اسلم آزاد نے کرشن موہن کو گنگا جمنی تہذیب کا نمائندہ شاعر قرار دیا اور ان کی شخصیت کی مختلف جہتوں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے کرشن موہن کی شاعری میں سیکولرزم اور رسالہ تحریک سے ان کی وابستگی پر اظہارِ خیال کیا۔ ڈاکٹر اسرائیل رضا نے کہا کہ کرشن موہن نے ہندستانی ثقافت، تہذیب اور مشترکہ کلچر کے عناصر اردو شاعری میں داخل کیے۔ ڈاکٹر صفدر امام قادری نے کہا کہ کرشن موہن نے سادہ و سلیس زبان و اسلوب سے اردو شاعری میں نمایاں اضافے کیے۔

نشست میں پروفیسر انیس فاطمہ، ڈاکٹر عطاء اللہ علوی، محمد حنیف، محترمہ درخشاں زرّیں اور کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

● وارانسی۔ پروفیسر عنوان چشتی کے انتقال پر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی میں ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر نجم الدین انصاری نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نسیم احمد نے کہا کہ پروفیسر عنوان چشتی شعر و ادب کا اعلا مذاق رکھتے تھے، ان کی تحریریں پُرمغز اور معروضی ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر عبدالسلیم اور ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے پروفیسر عنوان چشتی کے تنقیدی و تحقیقی درک اور تخلیقی جہتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی تنظیمی صلاحیتوں اور شخصی اوصاف کا تذکرہ کیا۔ اس تعزیتی جلسے میں اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالرز، طلبہ اور طالبات شریک ہوئے۔ (ڈاک سے)

● کھنڈوہ۔ معروف شاعر، ادیب، نقاد اور محقق پروفیسر عنوان چشتی کے انتقال پر انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ کھنڈوہ کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر محبوب راہی کے زیرِ صدارت ایک تعزیتی نشست کا انعقاد ہوا جس میں ڈاکٹر ایم آئی ساجد صدر شعبۂ اردو نوتن مراٹھا کالج بیاول (جلگاؤں) مہمانِ خصوصی تھے۔ جلسے میں ڈاکٹر شیخ موسیٰ، قاضی حسن رضا اور ایم آئی ساجد نے عنوان چشتی کے تحقیقی اور تنقیدی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں اردو ادب کی ایک نمایاں شخصیت قرار دیا۔ (ڈاک سے)

● رانچی، 15 رفروری۔ غلام علی خاں ریسرچ اینڈ اسٹڈی سینٹر کے زیرِ اہتمام ش۔ اختر کی نثری نظموں کے مجموعے ''وناش یاترا'' پر ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں سرور ساجد نے ''وناش یاترا: ایک تاثر'' اور ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی نے ''ایک مراجعت وناش کی'' کے زیرِ عنوان مقالے پیش کیے۔ اس ادبی محفل میں ڈاکٹر جمشید قمر، پروفیسر آر کے جھا اور ڈاکٹر صدیق مجیبی نے ''وناش یاترا'' کے حوالے سے گفتگو کی۔ ش۔ اختر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ''وناش یاترا'' کی نظموں کی تخلیق اندرونی کرب کو ہلکا کرنے کے لیے کی ہے۔ اس جلسے کی نظامت کے فرائض سرور ساجد نے انجام دیے۔ شکریے کی رسم ڈاکٹر قیوم ابدالی نے ادا کی۔ جلسے میں ڈاکٹر اسلم پرویز، رزاق اور مہتاب کے علاوہ متعدد لوگوں نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

● ''ہیں حوصلے تو پالیں گے منزلیں'' کے تحت اردو کونسل پمپری چنچوڑ کی نیشنل اینگلو اردو ہائی اسکول، پمپری کے 81 طلبہ و طالبات کو سینٹر آف انڈین آرٹ ریسورس اینڈ ٹریننگ (CIART) نئی دہلی، کی جانب سے مومنٹو اور سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر جلسے کے مہمانِ خصوصی لیفٹیننٹ زین العابدین خاں نے نیشنل اینگلو اردو ہائی اسکول کے تمام کامیاب طلبہ، انتظامیہ اور اساتذہ کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کونسل پمپری شہر میں

صحیح معنوں میں فروغ اُردو کے لیے کوشاں ہے۔ اردو کونسل کے پروگراموں، پروجیکٹوں اور کاموں کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو سماج کی بہتری کے تقاضے کے لیے اردو کونسل کوشاں ہے۔ جناب ادمے بنسالکر، روز نامہ سکال نے اردو کونسل کے صدر جناب قاسم زہیری کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ حقیقی اردو کے فروغ کے لیے اردو کونسل پمپری چنچوڑ شہر میں اہم رول ادا کررہی ہے۔ اس جلسے کی صدارت کیپٹن چتینگ راوموہتے، سینئر آفیسر گڈول کمپنی، بھوسری، نے انجام دی۔ نیشنل اینگلو اردو ہائی اسکول کی صدر معلمہ محترمہ شبانہ شیخ نے حاضرین کا استقبال کیا اور ہدیۂ تشکر سلطان بھائی، سکریٹری اردو کونسل نے پیش کیا۔ (ڈاک سے)

شعر و افسانہ کی محفلیں

● نئی دہلی، 10 رفروری۔ دہلی اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام نئی دہلی کے پیارے لال بھون میں شاعرات کے کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کا افتتاح مہمانِ خصوصی دہلی اسمبلی کی ڈپٹی اسپیکر محترمہ کرشنا تیرتھ نے کیا۔ اس مشاعرے کی صدارت معروف شاعرہ ملکہ نسیم نے اور نظامت مشہور صحافی اور شاعرہ نور جہاں ثروت نے کی۔ مشاعرے کا افتتاح کرتے ہوئے کرشنا تیرتھ نے اردو زبان اور مشاعرے کے حوالے سے اپنے پُرخلوص خیالات کا اظہار کیا۔ مشاعرے میں دہلی کی اہم ادبی شخصیات اور اکادمی کی گورننگ کونسل کے کئی ممبران موجود تھے۔ مشاعرے میں ملکہ نسیم، نور جہاں ثروت، سیدہ شان معراج، بلقیس ظفیر الحسن، عفت زریں، تاجور سلطانہ، ریحانہ نواب، نصرت چودھری، عظمیٰ اختر، نسیم بانو، پروین صبا، رعنا زیبا، شبانہ نذیر، زویا زیدی، شاہدہ صدیقی سحر، نگار عظیم، انا دہلوی، راشدہ باقی، شیاما سنگھ صبا، کیرتی کالے، شبنم درانی، ریکھا روشنی، نسیم نیازی اور شہناز زماں شبنم نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ (ڈاک سے)

● چھپرہ۔ مجاہد آزادی مولانا مظہر الحق کے یومِ ولادت پر اتحاد کمیٹی کے زیر اہتمام اُدت رائے (وزیر مملکت شہری ترقیات بہار سرکار) کی صدارت میں آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد ''مظہر الحق ایکتا بھون'' چھپرہ میں کیا گیا۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر عالی جناب چندریکا رائے وزیر کابینہ سائنس و ٹیکنالوجی بہار سرکار شریک ہوئے۔ ڈاکٹر مہدی جعفری کی نظامت میں نظر ایٹوی، طاہر فراز، ریحانہ نواب، حامد بہرائچی، ممتاز نسیم، بدر الدین بادل، الطاف ضیا، کلیم قیصر، حفیظ بلیاوی، سہیل عثمانی، شبنم بلیاوی، قمر سیوانی، منظر سلطان، سنیل کمار تنگ، بادشاہ راہی، ارون کمار، رضا حیدر چھپروی، خورشید ساحل اور معراج الدین تشنہ نے اپنے منتخب اشعار تحت و ترنم میں سنا کر سامعین کو محظوظ کیا۔ شہر کے باذوق حضرات کی موجودگی میں ہوئے اس مشاعرے کا اختتام سلیم پرویز کے شکریے کے ساتھ ہوا۔ (ڈاک سے)

● جلگاؤں، 15 رفروری۔ جلگاؤں اردو رائٹرز فورم کے زیرِ اہتمام شاہو نگر میں محفلِ افسانہ منعقد کی گئی جس کی صدارت محمد فاروق اعظمی نے کی۔ رائٹرز فورم کے صدر معین الدین عثمانی نے مہمانوں کا تعارف اور سکریٹری صغیر احمد نے خاندیش میں اردو افسانے کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر اردو رائٹرز فورم کی جانب سے ایم مبین (بھیونڈی) کا استقبال و اعزاز کیا گیا جنھیں ہندی ساہتیہ اکادمی دہلی نے پچاس ہزار روپے کے انعام سے نوازا ہے۔ محفل میں وحید امام، سید ذاکر حسین، صغیر احمد اور معین الدین عثمانی نے افسانے پیش کیے جن پر نور الحسنین، ایم مبین اور عظیم راہی نے تجزیے پیش کیے۔ وحید امام کی کہانی ''پنکی کا خط انّی کے نام'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے نور الحسنین نے اسے سامعین کو باندھے رکھنے والی متاثر کن کہانی قرار دیا۔ سید ذاکر حسین کی کہانی ''گھس پیٹھی'' کو انھوں نے موجودہ حالات کی صحیح عکاسی قرار دیا۔ صغیر احمد کی کہانی ''شناخت'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایم مبین نے کہا کہ یہ کہانی ملک میں ایک مخصوص فرقے کے عدمِ تحفظ کے احساس کو واضح کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ معین الدین عثمانی کی کہانی ''سایہ سایہ زندگی'' میں چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے انسانی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس موقعے پر عظیم راہی، ضیاء الدین شیخ، شکیل الدین سر اور بشیر پٹھان نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ اس محفلِ افسانہ کی صدارت محمد فاروق اعظمی، وحید امام اور سجاد حیدر نے کی۔ (ڈاک سے)

رسمِ اجرا

آدھا گاؤں

● ''کتاب انسان کی بہترین دوست ہے۔ کتاب انسان کو سجاتی، سنوارتی اور نکھارتی ہے۔'' پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان خیالات کا اظہار 16 ویں عالمی کتاب میلے میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے ترجمہ کردہ ناول ''آدھا گاؤں'' (مصنف راہی معصوم رضا) کا اجرا کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر مشہور شاعر طالب زیدی کی کتاب ''سلسلہ'' ڈاکٹر فاروق بخشی کی دو کتابوں ''مفاہیم'' اور ''اداس لمحوں کے موسم'' اور خوشحال زیدی کی کتاب ''اردو ادب اطفال میں خواتین کا حصہ'' کا بھی اجرا عمل میں آیا۔

ان کتابوں کا اجرا پروفیسر گوپی چند نارنگ پروفیسر قمر رئیس اور جناب م۔ افضل کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور صدارت پروفیسر قمر رئیس نے کی۔

اس موقعے پر مرغوب حیدر عابدی، ڈاکٹر جلال انجم، ثروت عثمانی، انجم

عثانی، ڈاکٹر ابن کنول، ڈاکٹر حسین ماجد، تنویر احمد، ڈاکٹر شمس الہدیٰ، ڈاکٹر کہکشاں لطیف، ڈاکٹر نگار عظیم، تسکین زیدی، ڈاکٹر عبدالعظیم، محمد خلیل، غزال ضیغم، خورشید اکرم، ابرار رحمانی، علیمہ سعدیہ، صدف زیدی، مودود صدیقی، احمد صغیر، مشتاق صدف اور فرمان احمد نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

ضمائر القرآن

● نئی دہلی، 27 جنوری۔ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام اردو گھر میں منعقدہ ایک تقریب میں آل انڈیا مسلم مجلسِ مشاورت کے صدر مولانا محمد سالم قاسمی نے ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی کی تصنیف ''ضمائر القرآن'' کی رسمِ اجرا انجام دی اور کہا کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کے ضمائر کو سمجھ لے تو اس سے قرآن کے معانی و مطالب کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں ہوگی۔

اس تقریب کی صدارت مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا سید نظام الدین نے کی۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی کی علم دوستی اور مذکورہ کتاب کی اہمیت و علمیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ایک پروفیسر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دینے کے ساتھ ضمائر القرآن جیسی بہترین کتاب بھی تصنیف کی۔ ڈاکٹر ابوالنصر خالدی کے صاحبزادے ڈاکٹر عمر خالدی (ناظم آغا خاں پروگرام برائے فنِ تعمیر، امریکہ) نے بھی اپنی تقریر میں اپنے والد کی علمی حیثیت پر روشنی ڈالی۔ اس تقریب میں پروفیسر بدرالدین الحافظ سابق صدر شعبۂ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی، سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ مولانا عبدالرحیم قریشی اور جناب سراج الدین قریشی صدر آل انڈیا اسلامک کلچر سینٹر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ کتاب مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی کی تحقیق و تعلیق اور تنقیح کے ساتھ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس پروگرام کی نظامت مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی نے کی۔

شرکا میں ڈاکٹر اے آر قدوائی سابق گورنر بہار و بنگال، فیضی عزیز ہاشمی ڈائرکٹر اطلاعات و نشریات دلی حکومت اور چیف اگزیکٹیو آفیسر دلی وقف بورڈ، ڈاکٹر ایس فاروق نائب صدر انڈیا اسلامک کلچر سینٹر، پروفیسر عبدالودود اظہر، سابق صدر شعبۂ فارسی جواہر لال نہرو یونیورسٹی، پروفیسر ریاض عمر، ڈاکٹر صلاح الدین، ڈاکٹر مجیب الرحمٰن، سلمان جعفری، حکیم ظل الرحمٰن، مولانا افتخار حسین مدنی، مولانا عبدالغفار اور مفتی عزیز الرحمٰن صاحبان قابلِ ذکر تھے۔ (ڈاک سے)

بند مٹھی کا بھرم

● ممبئی۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے زیرِ اہتمام منگرول پیر میں اردو محفل کا انعقاد عمل میں آیا۔ قلندریہ جونیئر کالج کے پرنسپل اور اردو اکادمی کے رکن ڈاکٹر ظفر پٹیل کی زیرِ نگرانی انعقاد پذیر اس محفل کی صدارت پربھنی کی ایم ایل سی محترمہ فوزیہ خاں نے کی اور افتتاح ایم ایل اے سبھاش راؤ ٹھاکرے نے کیا۔ سمینار کے موضوع ''اردو زبان کے فروغ میں اساتذہ کا کردار'' پر ڈاکٹر محبوب راہی، ڈاکٹر یوسف افغانی، ڈاکٹر مصطفےٰ خاں، ڈاکٹر نذیر احمد قریشی، محمد یحییٰ جمیل اور وحید خاں حارث نے مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محبوب راہی کے شعری مجموعے ''بند مٹھی کا بھرم'' کا اجرا سبھاش راؤ ٹھاکرے کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اپنی تقاریر میں شری ٹھاکرے، محترمہ فوزیہ خاں اور ڈاکٹر ظفر پٹیل نے ڈاکٹر محبوب راہی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ مہمانانِ خصوصی میں صدر بلدیہ محترمہ بانو چودھری، عبدالغنی سیٹھ، محمد امین احمد اور پی. سی. شیخو والا کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

بھیگی پلکیں

● آسنسول، 28 دسمبر۔ بسٹن بازار، آسنسول کے پلازا ہال میں معروف افسانہ نگار عابد ضمیر کے پانچویں افسانوی مجموعے ''بھیگی پلکیں'' کا اجرا پروفیسر شاہد اختر (صدر شعبۂ اردو، ہگلی محسن کالج) کے ہاتھوں ہوا۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ، کلکتہ کے جنرل سکریٹری پروفیسر سلیمان خورشید نے تقریب کی صدارت کی اور ایجوکیشنل کوآرڈی نیشن کمیٹی کے صدر پروفیسر نظام شمیم (ریٹائرڈ آئی پی ایس) مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اس موقعے پر پروفیسر مشتاق اعظمی، پروفیسر شاہد اختر، منصور انصاری ایڈووکیٹ، پروفیسر مشتاق اعظمی، پروفیسر شاہد اختر، منصور انصاری ایڈووکیٹ، ضیاء الرحمٰن ضیا، جلیل عشرت اور ادریس صدر احمد کمال حشمی نے عابد ضمیر کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔

پروفیسر سلیمان خورشید نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عابد ضمیر کے افسانے سماج اور انسانی زندگی کے مسائل سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ دل پر گزر جانے والی کیفیات کو ایسے مہذب انداز میں فنکاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ ان کے افسانے دل کو چھو لیتے ہیں۔

آخر میں ''رسمِ اجرا'' کمیٹی کے چیئرمین پرویز خاں شیدائی (کونسلر، آسنسول میونسپل کارپوریشن)، اشرف علی خاں (کنوینر) اور عابد ضمیر نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب کی نظامت سید جلال کاکوی نے کی۔

(ڈاک سے)

فکرِ ناتمام

● جموں۔ جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز میں مشہور شاعر فدا کشتواڑی کے مجموعۂ کلام ''فکرِ ناتمام'' کی رونمائی جموں و کشمیر کے وزیر خزانہ و قانون جناب مظفر حسین بیگ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔ تقریب کی صدارت پروفیسر ظہور الدین نے کی اور نظامت کے فرائض شام طالب نے انجام دیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اسد اللہ وانی اور ڈاکٹر برجی رومانی نے فدا کشتواڑی کی شاعری پر مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر ممتاز افسانہ نگار آنند لہر، جناب وید

تحسین، پروفیسر ظہورالدین اور اکادمی کے سکریٹری رمیش مہتا نے بھی اظہار خیال کیا اور فدا کشتواڑی کو ''فکر ناتمام'' کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی۔ جموں وکشمیر کی معتبر ادبی شخصیات کے علاوہ سامعین کی ایک بڑی تعداد اس موقعے پر موجود تھی۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

کرشن موہن

● نئی دہلی، 28 رجنوری۔ اردو کے مشہور بزرگ شاعر جناب کرشن موہن کا گذشتہ روز انتقال ہوگیا۔ وہ 82 برس کے تھے، مرحوم اردو شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ کرشن موہن 28 رنومبر 1922 کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی، وہیں سے انگریزی میں بی اے آنرز کیا اور پھر لاہور آ گئے۔ آپ نے لاہور کے گورنمنٹ کالج سے فارسی اور انگریزی میں ایم اے خصوصی نمبروں سے پاس کیا۔

مرغوب حیدر عابدی نے اردو اکادمی کے دفتر میں ایک تعزیتی میٹنگ کے دوران بتایا کہ کرشن موہن کے 28 شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے جن میں سے کئی مجموعوں کے ہندی تراجم بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ آپ کی اہم کتابوں میں شبنم شبنم اور آس میری کامنا کی قابلِ ذکر ہیں۔ عابدی نے مزید کہا کہ کرشن موہن نے وزیراعظم جناب اٹل بہاری واجپئی کی نظموں کا اردو ترجمہ کیا جسے اردو اکادمی دہلی نے شائع کیا۔

کرشن موہن نے ملازمت کا سلسلہ آل انڈیا ریڈیو (لکھنؤ) میں سب ایڈیٹر کے طور پر شروع کیا اس کے بعد انکم ٹیکس آفیسر کی پوسٹ پر تقرر ہو کر 1969 میں دلی آ گئے اور پھر پوری زندگی دلی میں ہی مقیم رہے۔ آپ اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ لاہور قیام کے دوران آپ حلقہ اربابِ ذوق لاہور کے تمام جلسوں میں پیش پیش رہتے تھے۔

اس موقعے پر اکادمی کے پورے اسٹاف نے دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ان کی آخری رسومات آج لودھی اسٹیٹ پر واقع شمشان گھاٹ پر ادا کی گئیں۔ اردو کے ممتاز شاعر اور ان کے دیرینہ رفیق مخمور سعیدی نے کہا کہ کرشن موہن اردو شاعروں کی اس نسل کے آخری شاعر تھے جنھوں نے ادب اور زندگی دونوں کے ساتھ وابستگی قائم رکھی۔ وہ عام بول چال کی زبان میں شعر کہنے والے قادرالکلام شاعر تھے۔ نظم میں ان کا تخلیقی اظہار زیادہ ہوا ہے۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

ہاجرہ نازلی

● علی گڑھ، 17 رمارچ۔ حقوق نسواں کی عملی علمبردار اور عالمی شہرت یافتہ ادیبہ محترمہ ہاجرہ نازلی کا کل یہاں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 83 سال تھی اور وہ گزشتہ 9 سال سے یہاں اپنی بیٹی شہناز کنول اور بیٹے منصور غازی کے پاس مقیم تھیں۔

محترمہ نازلی کی ولادت اور پرورش ایک اعلا مرتبہ کے دینی گھرانے میں دیوبند میں ہوئی، وہ مولانا قاسم نانوتویؒ کی پوتی اور قاری محمد طیب کی بیٹی تھیں۔ روایتی ماحول میں پرورش کے باوجود انھوں نے اپنے بزرگوں سے حقیقی مسلم خاتون کی خوبیاں اخذ کیں اور ادب کی دنیا میں نام کمایا۔ مرحومہ مولانا حامد الانصاری غازیؒ کی بیوہ تھیں جو طویل عرصے تک سہ روزہ ''مدینہ'' بجنور کے مدیر رہے، جس نے ملک کی جدوجہدِ آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔

مرحومہ نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ممبئی میں گزارا، وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ امریکا اور سعودی عرب میں بھی رہیں۔ ان کے 18 ناول اور درجنوں افسانے شائع ہو کر مقبول ہوئے جن میں خاص طور سے مسلم معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا گیا۔ مرحومہ کو بامحاورہ اردو پر عبور حاصل تھا۔ پسماندگان میں پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

نورتن کہانیاں

مصنف: محمد بخش مہجور / انتخاب: شمیم احمد

محمد بخش مہجور کی کتاب ''نورتن'' قدیم ادب میں اہم مقام کی حامل ہے۔ نو ابواب پر مشتمل اس کتاب میں دلچسپ انداز میں سبق آموز کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ زیرِ نظر انتخاب میں بچوں کی ذہنی صلاحیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کہانیوں کی زبان سہل اور عام فہم بنا دی گئی ہے تاکہ بچے انھیں بخوبی پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہو سکیں۔

صفحات: 192، قیمت: -/20 روپے

ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز

داستانیں ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف تفریحِ طبع کا ذریعہ ہیں وہیں ان سے متعلقہ عہد کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔
مافوق الفطری عناصر کی پیش کش سے قطعِ نظر داستانوں میں ہماری سماجی وثقافتی تاریخ پوشیدہ ہے۔ اس کتاب میں ایسی ہی تین داستانیں شامل ہیں۔

صفحات: 148، قیمت: -/18 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

تبصرہ وتعارف

کلیاتِ مصحفی جلد اوّل/ نثار احمد فاروقی

صفحات:-495، قیمت:-/220 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1 آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: مصباح احمد صدیقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا یہ قدم بڑا مستحسن اور قابلِ ستائش ہے کہ اس نے ایک بار پھر اردو قارئین کا رشتہ اس کے کلاسیکی ادب سے جوڑ دیا۔ اردو اساتذہ کے آثار جو قلمی صورت میں یا قدیم مطبوعات کی شکل میں ہمارے سرکاری یا غیر سرکاری کتب خانوں کی زینت تھے اور اردو کے عام قاری یا طالب علم کی ان تک رسائی مشکل یا ناممکن تھی، ان نوادر کی صحیح متن کے ساتھ دوبارہ اشاعت کر کے کونسل نے بلاشبہ اردو دنیا پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔

قومی کونسل کے انھی قابلِ ذکر کارناموں میں ایک کام کلامِ مصحفی کی نئے سرے سے تدوین و اشاعت ہے۔ غلام ہمدانی مصحفی اردو کے ایک اہم اور بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے اردو میں آٹھ ضخیم دیوان، ایک فارسی دیوان اور اردو فارسی شعرا کے تین اہم تذکرے اپنی یادگار چھوڑے۔ اگرچہ مصحفی کا اکثر کلام شائع ہو چکا ہے لیکن وہ اردو کے عام قاری کی دسترس سے دور تھا۔ قومی کونسل کے فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے مکمل کلام مصحفی کی جدید انداز سے تدوین و تصحیح متن کے ساتھ اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور اس کی تدوین و تصحیح کا کام ہندستان کے معروف محقق پروفیسر نثار احمد فاروقی کے سپرد کیا جو نہ صرف یہ کہ فارسی اور اردو زبان و ادب کا رچا ہوا مذاق رکھتے ہیں بلکہ کلاسیکی شعر و ادب کے رمز شناس بھی ہیں۔ آپ نے بڑی محنت، عرق ریزی اور لگن سے مصحفی کے دیوان اوّل کو ''کلیاتِ مصحفی جلد اوّل'' کے نام سے مرتب و مدوّن کیا جو ان کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ زیر نظر کلیات محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کے جامع پیش لفظ کے علاوہ امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کے پیش لفظ، پروفیسر نثار احمد فاروقی کے ''حرفِ اوّل'' اور فراق گورکھپوری کے مقدمے کے ساتھ مصحفی کی 710 غزلوں اور آٹھ دیگر اصنافِ سخن مثلاً مثنوی در ہجو پسرِ حجام، مثنوی در ہجو چارپائی، مثنوی در صفتِ اجوائن اور مثنوی جذبۂ عشق پر مشتمل ہے۔ فاروقی صاحب نے شروع میں تمام غزلیات کی مع صفحہ اور غزل نمبر کے فہرست بھی دی ہے، جس سے کسی بھی غزل یا شعر کو تلاش کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ فہرست میں غزل کا دوسرا مصرع دیا ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے مصحفی کے کلام میں آئے مشکل اور ادق الفاظ کے معنی دینے کے ساتھ تشریح بھی کر دی ہے جس سے عام قاری کو کلام مصحفی کے سمجھنے میں آسانی ہوگی اور اس کی دلچسپی بڑھے گی۔

علاوہ ازیں مصحفی کے کلام میں مستعمل وہ مضامین و مفاہیم جو دوسرے استاد شعرا کے یہاں بھی ملتے ہیں انھیں بھی حواشی میں درج کر دیا گیا ہے۔ مثلاً سودا، میر، غالب، ذوق، مومن، داغ وغیرہ۔

عربی فارسی اور اردو شعر و ادب پر فاروقی صاحب کی نظر بہت گہری ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ ان کی تنقیدی بصیرت، ذہن و نظر کو بالیدگی عطا کرتی ہے۔ دلی اور لکھنؤ اسکول اور روہیل کھنڈ کی زبان، زبان کی فنی باریکیوں اور روزمرّہ و محاورات پر ان کی بھرپور گرفت ہے۔ قوی امید ہے کہ ''کلیاتِ مصحفی جلد اوّل'' اردو حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور اردو کے کلاسیکی ادب کے شائقین کی توجہ کا مرکز بنے گی۔

میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ صاحب کا تمام اردو دنیا کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے ایک اہم اور قیمتی سرمائے کو اتنی کم قیمت میں (یعنی 495 صفحات پر مشتمل کلیات معیاری کاغذ، عمدہ گیٹ اَپ اور کمپوزنگ کی اغلاط سے پاک و صاف کتاب صرف 220 روپے میں) ہم تک پہنچائی۔

•

صنعتی تنظیم اور انتظام/ محمد احترام اللہ

صفحات:-606، قیمت:-/149 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1 آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: معین الدین خاں

ہندستان میں انگریزی اور ہندی کے علاوہ کم از کم ایک درجن زبانوں میں اسکول سے کالج تک کی تعلیم کے نظم و نسق کا چرچا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی محال ہے کہ انگریزی، ہندی اور چند دیگر زبانوں کو چھوڑ کر دوسری ہندستانی زبانوں میں تعلیمی صورت حال غیر تشفی بخش ہی نہیں، پریشان کن بھی ہے۔ جس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ مثلاً خود متعلقہ زبان کا غیر ترقی یافتہ ہونا، تعلیمی نظام کی خامیاں اور کمزوریاں اور ان میں سب سے اہم ہے معیاری کتابوں کی قلت۔ ایسے میں محمد احترام اللہ کی کتاب ''صنعتی تنظیم اور انتظام'' نہ صرف بی.کام. کے طالب علموں کی ضرورت کو پورا کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دوسرے رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

اس کتاب کو مختلف عنوانات کے تحت 25 ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دو ابواب کاروبار کی نوعیت، وسعت اور کاروباری تنظیموں کے مختلف روپوں سے روشناس کراتے ہیں۔ آج ہم جس صارف سماج میں سانس لے رہے ہیں، صارف کو معیشت کا ''بادشاہ'' قرار دیا جاتا ہے لیکن بازار کی بھول بھلیوں میں اس

کی حیثیت گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ حکومت کے ذریعے چلائے جانے والے کاروباری ادارے صرف منافع کے محتاج نہیں ہوتے لیکن منافع کے بغیر کسی ادارے کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے اور حکومت بالآخر اس کا سودا کر دیتی ہے۔ چوتھے باب میں دکھایا گیا ہے کہ کمپنی کی تشکیل اور قیام کس طرح عمل میں لایا جاتا ہے، پانچواں باب اس پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔ چھٹے باب کا تعلق صنعتی سرمایہ کاری سے ہے۔ آج بڑی بڑی کمپنیاں تشکیل دی جاتی ہیں اور ان کے لیے خطیر سرمایے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگلے باب میں (Capitalisation) کا تفصیلی ذکر ہے اور نویں باب میں باہمی فنڈ کے متعلق جانکاری دی گئی ہے۔

آج کے صنعتی نظام کو پروان چڑھانے میں شیئر بازار کا رول فیصلہ کن ہو گیا ہے۔ شیئر کے ذریعے خطیر سرمایہ جمع کیا جاتا ہے اور جب یہ سرمایہ شیئر بازار میں پہنچتا ہے تو اس سے کاروبار کو مزید پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے اور اس کے کاروبار پر SEBI نظر رکھتی ہے لیکن اس بات کا ذکر نہیں ملتا کہ شیئروں کی قیمتوں میں کس طرح اضافہ یا کمی ہوتی ہے اور کس طرح Share-Index کو وضع کیا جاتا ہے۔ گیارھویں باب میں صنعتی نظام کو فعال بنانے میں حکومت کے رول پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب تک سرکار مختلف مواقع پر کئی پالیسیاں وضع کر چکی ہے اور آج تو یہ عالم ہے کہ سرکار مراعات دے کر کاروبار کو استحکام عطا کرنے میں لگی ہے۔ 1991 کی نئی اقتصادی پالیسی کے نتیجے میں ملک میں معاشی آزاد روی (Liberalisation) نجی کرن (Privatisation) اور عالم کاری (Globalisation) کی جو لہر چلی، آج وہ اپنا منطقی سفر طے کر رہی ہے۔ آئندہ ابواب میں صنعت کی اکائیوں سے بحث کی گئی ہے۔

عصر حاضر میں انتظامی شعبہ (management) ایک مقبول عام شعبہ ہے۔ اس باب میں اسی سے بحث کی گئی ہے۔ کاروبار میں انتظام کی اہمیت، اس کی شاخیں اور ذمے داریاں کیا ہیں؟ امریکہ میں کارپوریٹ سیکٹر میں جو گڑبڑ اور گھپلے بازیاں ہوئیں، ان سے ان کی ساکھ کافی گری ہے۔ ایک کامیاب منتظم صرف حال پر ہی نظر نہیں رکھتا بلکہ وہ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ آج کے صنعتی نظام میں مقابلہ آرائی کا زور ہے جس کے لیے پیداواری نظام کو چست درست بنانا اور پیداواری اخراجات کو کم کرنا ضروری ہے۔

آئندہ ابواب میں اختیارات کی مرکوزیت، عدم مرکوزیت، صیغہ بندی، تال میل اور انضباط کے طریق کار پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب نہ صرف نصاب کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے بلکہ ایک عام قاری کو بھی جدید معاشی موضوعات کو صحیح پس منظر میں سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔

بعض جگہ مقامی الفاظ غیر مانوس معلوم ہوتے ہیں۔ عالمی اشتراک کی پالیسی 1990 سے نہیں بلکہ 1990 کے دہے میں شروع ہوئی۔ کتاب میں Suggested Reading، اشاریہ، اصطلاحوں کی فہرست اور ان کی تعریف بھی شامل کی جاتی تو کتاب کی اہمیت مزید بڑھ سکتی تھی۔

●

درد۔۔۔علامت اور علاج / ابوسعد خالد جاوید

صفحات: 212، قیمت: 50/-روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1 آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: حکیم اشہر قدیر

طبیعت کے منافی احساس کا نام درد ہے لیکن درد جسم میں لاحق ہونے والے مرض کی مخبری بھی کرتا ہے۔ بالخصوص جب کسی وجہ سے جسم کے مواد کو نقصان پہنچ رہا ہو تو درد ہی طبیعت کو مجبور کرتا ہے کہ وہ جسمِ طبیعی کو اُس نقصان سے باخبر کرے تاکہ نقصان کا سدِّ باب کیا جائے۔

اسی طرح جب بعض اسباب کی بنا پر حس و حرکت کا مرکز دماغ یا اعصاب اپنے فعلِ طبعی سے منحرف ہو کر مفلوج ہو جاتے ہیں تو ان میں دوبارہ حساسیت پیدا کرنے کی غرض سے درد ہی سے علاج کیا جاتا ہے۔ دماغی امراض میں الیکٹرک شاک دینا یا ایکوپنکچر میں سوئی چبھو کر علاج کرنا اسی اصول کے تابع ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں طب یونانی کی رو سے درد کی تعریف، اسباب، علامات اور علاج سے بحث ہے۔ مواد کی اہمیت کا اندازہ کتاب کے اولین سطور سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ''مریض کی اضطراری کیفیت طبیب سے تقاضہ کرتی ہے کہ وہ تشخیصی الجھنوں میں پھنسنے سے پہلے مریض کو تڑپا دینے والی صورتِ حال سے نجات دلائے۔'' (صفحہ-9)

جملہ متن گیارہ ابواب میں منقسم ہے۔ باب اول میں درد کا عمومی تذکرہ ہے جہاں درد کے عمومی علاج کے تحت مختلف درد کش تدابیر اور مجرب نسخے پیش کیے گئے ہیں۔ باب دوم سے باب گیارہ تک بالترتیب سر، آنکھ، کان، دانت، معدہ، جگر و پتہ، طحال (تلی)، گردہ اور امعا (آنت) میں لاحق ہونے والے مختلف الانواع دردوں کے اسباب، علامات اور طریقۂ علاج کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ گیارھویں باب میں درد امعا کے ساتھ ہی جوڑوں میں ہونے والے درد (گٹھیا) کی اقسام و علاج درج ہیں۔ اگر اس کے لیے علاحدہ باب قائم کیا جاتا تو بہتر تھا۔

فنی نقطۂ نظر سے کتاب معتبر نظر آتی ہے۔ زبان و بیان بھی طبی اعتبار سے معیاری ہے۔ کتاب اپنے موضوع کا حق ادا کرتی ہے اور یونانی طریقۂ علاج کے شیدائیوں کے لیے ایک بہترین تحفہ ہے۔ خاص طور سے اس کتاب میں جو مجرب نسخے پیش کیے گئے ہیں وہ انتہائی سہل الحصول، سستی اور بے ضرر دواؤں پر مشتمل ہیں۔ جبکہ آج کل درد کے ازالے کے واسطے جو دوائیں استعمال ہو رہی ہیں وہ معدے اور اعصاب پر مضر اثرات ڈالتی ہیں۔ ان کے طویل استعمال سے ''ڈرگ ڈپنڈینسی'' بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ ایسے حالات میں درد کے موضوع پر یہ کتاب اور اس میں درج طریقۂ علاج عوام الناس کے لیے درد کا متبادل علاج پیش کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

●

ادبی جہات/انور پاشا

صفحات:-192، قیمت:-/100روپے
ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-6
مبصر:ابوظہیر ربانی

''ادبی جہات'' ڈاکٹر انور پاشا کے اٹھارہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یوں تو تمام مضامین مختلف نوعیت کے ہیں لیکن ڈاکٹر پاشا ہر مضمون میں زندگی اور ادب کی مثبت قدروں کو کسی نہ کسی پہلو سے زیر بحث لائے ہیں اور ادب کے اہم گوشوں اور پہلوؤں کا بھی احاطہ کیا ہے۔

شروع کے چار مضامین بظاہر الگ الگ عنوان کے تحت ہیں لیکن یہ چاروں موضوع کے اعتبار سے ناول سے تعلق رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے ناول کے آغاز کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعد ازاں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے گئے ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ، اس دور کے ناولوں میں پائے جانے والے رجحانات، تکنیک اور فن کی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پاکستانی ناولوں کے تہذیبی پس منظر کا احاطہ کرتے ہوئے مصنف نے پاکستانی تہذیب وثقافت کی تشکیل وتعمیر سے متعلق بنیادی نظریات پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ مصنف نے 1947 سے 1980 کے درمیان دونوں ممالک میں لکھے گئے ناولوں کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے جو دلچسپ نتائج کا حامل ہے۔ نیز 1980 کے بعد پاکستان میں لکھے گئے ناولوں کے تجزیے کے ذریعے مصنف نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندستانی ناولوں کے مقابلے میں پاکستانی ناولوں کا دامن کن وجوہ کی بنا پر نسبتاً وسیع اور متنوع ہے۔

''سماجی تبدیلی، جدیدکاری اور پریم چند''، ''الیاس احمد گدی ایک منفرد فنکار''، ''آل احمد سرور ایک جامع تنقیدی نظام کے علمبردار'' اور ''معاصر تنقید اور آل احمد سرور'' شخصی نوعیت کے مضامین ہیں۔ ادیب کے نظریات اور رجحانات کا معروضی جائزہ لینا ہر تنقید نگار کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ان شخصی نوعیت کے مضامین میں متعلقہ شخصیتوں کا جس طرح تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اس سے انور پاشا کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ شعرا سے متعلق دو مضامین ہیں، ایک ''شاعر انسانیت رابندر ناتھ ٹیگور'' اور دوسرا ''کیفی اعظمی کا جمالیاتی شعور''۔ یہ دونوں مضامین بھی توجہ کے مستحق اور قابل داد ہیں۔ اردو زبان سے متعلق مضامین کے مطالعے سے ہندستان کے متنوع لسانی پس منظر کے ساتھ اردو زبان کے ارتقا اور نشو ونما پر بھی روشنی پڑتی ہے اور کچھ نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔ ماضی میں سامراجی سازشوں کا اردو کس طرح شکار ہوئی؟ قومی بیداری کی تحریک کے دوران ایک انقلابی کردار ادا کرنے والی زبان آزادی کے بعد اپنا حق حاصل کرنے سے کس طرح محروم ہوگئی؟ آج اس کی صورت حال کیا ہے؟ ایسے کئی غور طلب سوالات ہیں جن پر نہایت بصیرت افروز بحث کی گئی ہے۔ پرائمری سے اعلا سطح تک اردو کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر موصوف کی گہری نظر ہے۔ اردو کے حق میں ماحول اور فضا خوشگوار اور سازگار ہو سکے اس کے لیے ڈاکٹر انور پاشا نے اردو والوں کو بعض خطوط پر کام کرنے کی تاکید بھی کی ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے صرف انتظامیہ پر تکیہ کرنے کو مصنف نے مناسب رویہ قرار نہیں دیا ہے۔ متفرقات میں ''ترقی پسند تنقید اور ادب کی تخلیق اور تفہیم کی ادبی وغیر ادبی، بنیادیں''، ''اردو میں ڈرامے کی تنقید کا نقش اوّل'' اور ''آزادی سے قبل ہندستان میں فرقہ پرستی کا مسئلہ اور مولانا سید سلیمان ندوی کا نقطۂ نظر'' جیسے موضوعات زیر بحث ہیں۔ ''اکیسویں صدی میں ادب اور قاری کے بدلتے رشتے کی نوعیت'' کتاب کا آخری مضمون ہے۔ اس میں بھی ایک غیر روایتی نقطۂ نظر اور نیا زاویۂ فکر سامنے آتا ہے۔ ''ادبی جہات'' ادب کے افہام وتفہیم کے حوالے سے ایک اہم اور دلچسپ کتاب ہے۔ مصنف نے اپنی حقیقت بیانی اور دل پذیر اسلوب سے کتاب کو قابل مطالعہ بنا دیا ہے۔

•

اردو ناول پر تقسیم ہند کے المیے کے اثرات/محمد نسیم

صفحات:-256، قیمت:-/250روپے
ناشر: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-800004
مبصر: فیاض عالم

برصغیر ہند کی تقسیم ایک ایسا المیہ ہے جس کی نظیر تاریخ میں شاید ہی ملے۔ مذہبی بنیاد پر عمل میں آنے والی یہ تقسیم محض دو خطوں کی تقسیم نہ تھی، اس نے والدین سے ان کی اولادیں، بھائیوں سے بہنیں اور شوہروں سے ان کی بیویوں کو ہی جدا نہیں کیا بلکہ اس نے صدیوں کے سماجی رشتوں کو بھی کاری ضرب لگائی۔ اس کرب ناک سانحے نے برصغیر ہندو پاک کے عوام کی زندگی کے تمام شعبوں پر اپنے گہرے اثرات مرتسم کیے۔ سیاست، مذہب، معاشیات، تہذیب وثقافت اور علم و ادب کچھ بھی اس سے اچھوتا نہ رہا۔ اردو ناولوں میں اس واقعے کو بالخصوص موضوع بنایا گیا اور تقسیم کی تباہ کاریوں اور انسانی حقوق کی پامالی کی عکاسی کی گئی۔ زیر تبصرہ کتاب میں چند اہم ناولوں کی روشنی میں تقسیم ہند کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ہندستان کی تحریک آزادی، دوسرے باب میں ہندستان میں فرقہ وارانہ منافرت اور اس کے نتیجے کے طور پر ملک کی تقسیم اور تیسرے باب میں آزادی کے بعد لکھے گئے اردو ناولوں کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ باب چہارم کتاب کا کلیدی باب ہے جس میں ''اردو ناول پر تقسیم ہند کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غم دل''، ''آگ کا دریا'' اور ''آخر شب کے ہم سفر''، انتظار حسین کے ناول ''بستی'' اور ''تذکرہ''، خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' اور ''زمین'' عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں''، حیات اللہ انصاری کا ''لہو کے پھول''، جیلانی بانو کا ''ایوانِ غزل''، کرشن چندر کا ''غدار''، نسیم حجازی کا ''خاک اور خون'' اور عبدالصمد کے ناول ''دو گز زمین'' اور ''خوابوں کا سویرا'' زیر بحث آئے ہیں۔

آخری باب میں مذکورہ ناولوں کی ادبی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے تجزیاتی طریقۂ کار اپنایا ہے اور اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ معروضیت قائم رہے۔ زیر نظر کتاب تقسیم ہند اور اردو ناول کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں کے ضمن میں ایک اہم اضافہ ہے۔

□□□

بچوں کا گوشہ

تحریر: شنکر
ترجمہ: خسرو متین

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انہیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ کونسل نے چلڈرن بک ٹرسٹ کے اشتراک سے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب "ہندوستان کی کہانیوں کا خزانہ" (جلد اوّل) سے ایک کہانی پیش کی جارہی ہے۔

ہندستان قصے کہانیوں کا ملک ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ اور ان کے درمیان پھیلی بولی بھانت بھانت کی کہانیاں اس ملک کی خصوصیت ہیں۔ دیومالائی اور مافوق الفطرت کہانیاں جتنی ہمارے پاس ہیں، شاید ہی کسی اور ملک میں ہوں۔ "کتھاسرت ساز"، "پنچ تنتر"، "بیتال پچیسی" اور "سنگھاسن بتیسی" جیسی شہرۂ آفاق کتابیں یہاں لکھی گئیں۔ "ہندستان کی کہانیوں کا خزانہ" میں 12 دلچسپ عوامی کہانیاں پیش کی گئی ہیں جو بچوں کے ساتھ بڑوں کو بھی پسند آئیں گی۔ چند کہانیوں کے عنوانات یہ ہیں۔ "پریم اور کچھوا"، "بلّوشاہ کنجوس"، "چاندی کی نوکری"، "تیجی مالا"، "تقدیر بنام تدبیر"، "سونے کی دم والا سانپ" اور "جادو کا شنکھ"۔ 104 صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف 37.00 روپے ہے۔

ننانوے کا پھیر

کسی زمانے کی بات ہے، کیرل میں رامو اور دامو نام کے دو آدمی رہتے تھے۔ وہ دونوں پڑوسی تھے۔ ان کے مکان بھی ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ رامو سوداگر تھا اور اس کا کام اچھا خاصا چل رہا تھا۔ دامو معمولی آدمی تھا اور محنت مزدوری کر کے گزر بسر کر رہا تھا۔

رامو امیر ہونے کے باوجود بے حد کنجوس تھا۔ وہ بہت کفایت اور کنجوسی سے خرچ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ کھانے پینے میں بھی وہ خرچ کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک ہی سبزی یا دال سے پورا دن گزارا کرتے۔ کبھی کسی کو اپنے یہاں دعوت پر نہیں بلاتے تھے۔

اُدھر دامو غریب ہونے کے باوجود بڑے مزے کی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ اور اس کی بیوی جو کچھ کماتے سارا خرچ کر ڈالتے۔ اچھا پہنتے اور اچھا کھاتے۔ اپنے دوستوں اور رشتے داروں کو اکثر اپنے یہاں کھانے پر بلاتے۔ رات میں فرصت کے لمحات میں کھڑتال یا تالیاں بجا کر طرح طرح کے گانے گاتے۔

رامو کی بیوی کا نام شوبھا تھا۔ وہ اکثر سوچتی، یہ دامو اتنی کم آمدنی میں کس طرح ٹھاٹھ سے رہ لیتا ہے۔ کیسے اتنا روپیہ خرچ کر لیتا ہے کہ اسے کوئی فکر یا پریشانی نہیں۔

شوبھا کے پتی کے پاس دامو سے کہیں زیادہ روپیہ پیسہ تھا۔ پھر بھی اس کے لیے بچت کرنا بڑا مشکل تھا۔ وہ کئی بار کچھ خریدنا چاہتے مگر نہیں خرید پاتے تھے۔ وہ اکثر دامو اور اس کی بیوی چارو کو دیکھتی رہتی اور ان کی خوشحال زندگی کا راز جاننے کی کوشش کرتی۔ مگر ہزار سوچنے پر بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔

دوپہر کے وقت شوبھا اور چارو اکثر اپنے اپنے دروازے پر کھڑے ہو کر باتیں کرتیں۔ ان کے مکانوں کے درمیان ایک باڑ تھی۔

وہ باڑ کے اندر سے جھانکتی ہوئیں دیر تک باتیں کرتی تھیں۔

ایک بار جب ایسے ہی کھڑی باتیں کر رہی تھیں کہ شوبھا نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ اس نے چارو سے پوچھا کہ وہ ہمیشہ اتنے ٹھاٹھ سے کیسے خرچ کر لیتے ہیں اور ایسی بے فکری اور خوشحالی کی زندگی کیسے گزار رہے ہیں۔؟

''میں کیا جانوں۔'' چارو نے مسکرا کر جواب دیا۔

''میرے خیال میں تو یہ بات میرے پتی کو بھی معلوم نہیں۔ ہوسکتا ہے تمھارے پتی جانتے ہوں۔

وہ تو بہت سمجھ دار ہیں۔ ہیں نا۔''

اس جواب سے شوبھا کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے اپنا سوال اپنے پتی کے سامنے رکھا۔ جیسا کہ چارو نے کہا تھا، اس کا پتی بہت ہی چالاک آدمی تھا۔ داموکے بارے میں اپنی بیوی کا سوال سن کر رامو مسکرانے لگا۔

''میری رانی!'' اس نے کہا۔'' داموااور اس کی بیوی جو بے فکری کی زندگی گزار رہے ہیں اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ بے چارہ داموابھی ننانوے کے پھیر میں نہیں پڑا ہے۔

''ننانوے کا پھیر۔ یہ کیا ہوتا ہے۔؟'' اس کی بیوی نے پوچھا'' میں تو خاک بھی نہیں سمجھی۔''

''سمجھاؤں تو بھی تم نہیں سمجھوگی۔'' رامو نے کہا۔'' اس لیے سمجھانا بھی فضول ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں سمجھنے سے پہلے خود دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔''

شوبھا نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر زبانی جمع خرچ سے زیادہ کام میں یقین رکھتا ہے۔ جو بات وہ کہنا نہیں چاہتا اسے کہلوانا بھی مشکل ہے۔ اس لیے مزید کچھ پوچھنا بیکار تھا۔

'' کچھ دن اور ٹھہرو۔ تم اپنے آپ سمجھ جاؤ گی۔'' رامو نے آگے کہا۔ اس جواب سے اس کی بیوی مطمئن ہوگئی۔

کچھ دن بعد شوبھا نے دیکھا کہ پڑوسی کا گھر کچھ بدلا بدلا نظر آ رہا ہے۔ کہیں کچھ گڑ بڑ ضرور ہے۔ داموااور اس کی بیوی کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے تھے۔ اب ان کے گھر سے نہ تو مچھلی تلنے کی خوشبو آتی تھی اور نہ ہی گوشت کے بھوننے کی۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ داموکے گھر دوست اور رشتے دار تو آتے تھے لیکن پہلے کی طرح ان کی دعوتیں نہیں ہوتی تھیں اور تو اور پہلے کی طرح وہ راتوں کو گانا بجانا بھی ختم ہوگیا تھا۔ چارو دن بھر بیٹھی ناریل کے پتوں کی چٹائیاں بنتی رہتی اور شام ہوتے ہی انھیں بازار میں بیچنے چلی جاتی۔ رات کے وقت داموبھی چارو کے ساتھ بیٹھ جاتا اور پھر دونوں چٹائیاں بننے لگتے۔

''یہ کیا عجوبہ ہے۔؟'' شوبھا نے دل ہی دل میں کہا۔

'' جانے اس گھر میں کیا ہوگیا ہے۔؟ ان لوگوں کو اپنے کام سے منٹ بھر کی فرصت نہیں۔ اس کے علاوہ دونوں بڑے فکر مند نظر آتے

ہیں۔لگتا ہے یہ لوگ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا چاہتے ہیں۔'' اس نے اس غیر معمولی تبدیلی کی بات اپنے شوہر سے کہی۔

''کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ اب ایک بھی پیسہ فالتو خرچ نہیں کرتے اور دن رات چٹائیاں بُن کر بیچتے رہتے ہیں۔؟''

''مجھے کیسے معلوم ہوگا۔؟'' اس کے شوہر نے جواب دیا۔

''بہتر ہوگا کہ تم خود جاکر اپنی پڑوسن سے پوچھ لو۔''

شوبھا یہی بات چارو سے بھی پوچھنا چاہتی تھی مگر اسے موقعہ نہیں ملتا تھا۔ چارو دن رات کام میں مصروف رہتی۔ اب پہلے کی طرح باڑ کے پاس کھڑے ہوکر باتیں کرنے کی اُسے بالکل فرصت نہیں تھی۔

آخر کار جب شوبھا سے ضبط نہ ہوسکا تو وہ اس راز کا پتا لگانے چارو کے گھر جا پہنچی۔ اُس وقت چارو چٹائی بننے میں مصروف تھی۔ شوبھا کو دیکھ کر وہ کھڑی ہوگئی اور ایک چٹائی بچھا کر پھر کام میں لگ گئی۔ شوبھا سے باتیں کرتے وقت بھی اس کا کام بند نہیں ہوا۔

کچھ دیر تک دونوں یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ کبھی اپنے دوستوں کی، کبھی رشتے داروں کی اور کبھی گاؤں کی زندگی کی۔

پھر باتوں ہی باتوں میں شوبھا نے چپکے سے اپنا وہ سوال پوچھ ہی لیا جو اُسے اتنے دنوں سے پریشان کیے ہوئے تھا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے چارو؟ کیا دامو کو آج کل کام کی تنگی ہو رہی ہے؟''

''نہیں رے۔'' چارو نے جواب دیا۔'' بھگوان کی کرپا سے انھیں کافی کام مل جاتا ہے۔''

''لیکن، میں تو دیکھ رہی ہوں کہ اب کوئی بھی چیز پہلے جیسی نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے آج کل مچھلی اور گوشت پکانا کیوں بند کر دیا ہے۔ گانا بجانا بھی چھوٹ گیا ہے۔ دن بھر چٹائیاں بنتی رہتی ہو اور نہ جانے کیوں اتنی پریشان دکھائی دیتی ہو؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' چارو نے جواب دیا۔

''بس یوں سمجھ لو کہ اب ہمارے رہنے کا ڈھنگ بدل گیا ہے۔''

''نہیں۔'' شوبھا نے کہا۔'' کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔ ویسے اگر تم مجھے بتانا نہیں چاہتیں تو تمھاری مرضی۔ میں تو تمھاری مدد کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے پوچھ بھی رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید تمھیں روپے پیسوں کی ضرورت ہو۔ اگر ایسا ہے تو بتاؤ۔ میں اپنے پتی سے کہوں گی۔''

''ارے نہیں۔ چارو نے فوراً جواب دیا مگر دل ہی دل میں اُسے شوبھا کی یہ بات بُری لگی۔ اس نے آگے کہا۔

''ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ تم چاہتی ہو تو میں تمھیں اصل بات بتائے دیتی ہوں۔ لیکن، کسی سے کہنا نہیں۔ کہیں میرے پتی کو پتا چل گیا تو وہ مجھ پر بہت ناراض ہوں گے۔''

''میں کسی سے نہیں کہوں گی۔'' شوبھا نے کہا۔

''تم تو مجھے جانتی ہی ہو۔ مجھے بتایا ہوا بھید ایسا ہے جیسے کنوئیں میں پھینکا ہوا کنکر۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔''

''اچھی بات ہے تو سنو۔'' چارو نے آگے کہا۔'' دو تین ہفتے پہلے کی بات ہے۔

میرے پتی کام سے لوٹ رہے تھے ان کے پاس اپنی کمائی کا ڈیڑھ روپیہ تھا۔ لیکن، جیسے ہی وہ اپنے گھر کے دروازے کے پاس پہنچے تو انھیں سیڑھی پر ایک چھوٹی، سفید تھیلی پڑی دکھائی دی۔ انھوں نے تھیلی اُٹھالی۔ تھیلی بھری تھی اور اس کے اندر چھن چھناہٹ ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اندر روپے ہیں۔''

''کیسی عجیب بات ہے۔؟'' شوبھا نے کہا۔'' روپوں کی تھیلی۔''

''پوری بات تو سنو۔'' چارو نے اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔'' وہ تھیلی اٹھا کر اندر لے آئے۔ چٹ پٹ کمرے میں گھسے اور اندر سے کنڈی بند کرلی۔ اس وقت میں رسوئی میں تھی۔ لیکن میں نے ان کو اندر آتے دیکھ لیا تھا۔ کمرے کے پاس جاکر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ انھوں نے مجھے اندر آنے دیا۔ اندر قدم رکھتے ہی میں سمجھ گئی کہ ان کی عجیب حرکتوں کی وجہ کیا ہے۔ میرے سامنے چار پائی پر روپوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ وہ بھی روپے سفید تھیلی میں تھے۔''

''روپوں کا ڈھیر۔!'' شوبھا نے حیران ہوکر پوچھا۔'' کتنے روپے تھے۔؟''

''ہم نے انھیں گنا۔'' چارو نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔'' گن کر دیکھا تو کل ننانوے روپے تھے۔'' ننانوے۔'' شوبھا نے پوچھا۔'' سو میں ایک ہی کم۔ پورے سو ہونے چاہیے تھے۔''

''نہیں۔ صرف ننانوے تھے۔ ہم نے کئی مرتبہ پوری احتیاط سے گنا۔ مگر وہ کل ننانوے تھے۔ ننانوے ہی رہے۔'' پھر شوبھا نے پوچھا۔

''ہم نے سوچا۔ کیسے افسوس کی بات ہے۔؟ پورے سو نہیں صرف ننانوے ہی ہیں۔ تب میرے پتی نے اپنی مزدوری کا ایک روپیہ نکالا اور پورے سو کر دیے اب ہمارے پاس صرف آٹھ آنے بچے تھے۔ مجھے دوسرے دن کا خرچ صرف آٹھ آنے ہی میں چلانا پڑا۔''

''اوہ!'' شوبھا نے کہا۔'' دوسرے دن جب میرے پتی واپس آئے تو'' چارو نے قصہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔'' کہنے لگے کہ اب چوں کہ ہمارے پاس پورے سو روپے ہیں۔ اس لیے کیوں نہ بچت کر کے انھیں پورے دو سو بنا دیں۔ تب انھوں نے اپنی مزدوری کا ایک روپیہ الگ رکھ کر مجھے باقی آٹھ آنے دے دیے۔ تب سے آج تک یہی سلسلہ چلا آرہا ہے۔''

''اوہ! میں سمجھ گئی۔'' شوبھا نے کہا۔'' کہ اب تمھارے گھر مانس مچھلی کیوں نہیں بنتی۔ تمھارے گیت کیوں بند ہوگئے ہیں اور تم ہر وقت اتنی پریشان کیوں دکھائی دیتی ہو۔؟ میں یہ بھی سمجھ گئی کہ تم دن رات چٹائیاں کیوں بنتی رہتی ہو۔ یہ ننانوے کے پھیر کا ہی جادو ہے جس نے سب کچھ بدل دیا ہے۔''

□□□

ٹیلی ویژن دیکھنے سے بچوں کے دماغ اور آنکھیں متاثر

ٹیلی ویژن دیکھنے کی عادت سے نہ صرف بچوں کا ذہنی توازن متاثر ہو رہا ہے بلکہ ان کی آنکھیں بھی خراب ہو رہی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر تشدد، عریانیت اور راسخ الاعتقادی کو بڑھاوا دینے والے پروگراموں کے سبب بچوں میں اخلاقی، سماجی اور ثقافتی اقدار کی گراوٹ کے سلسلے میں دنیا بھر کے ڈاکٹر، ماہرینِ نفسیات اور ماہرینِ تعلیم تشویش میں مبتلا ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ ٹیلی ویژن دیکھنے کے بڑھتے رجحان کے سبب بچوں کی آنکھوں اور ان کے ذہن کو مستقل طور پر نقصان پہنچ رہا ہے۔ ناگپور میں واقع سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف بی ہیویرل سائنسز (سی آئی بی ایس) کی جانب سے دو سال تک وسیع پیمانے پر کیے گئے مطالعے میں پایا گیا ہے کہ ٹیلی ویژن سے نکلنے والی کیتھوڈ کرنیں 13 سال سے کم عمر کے بچوں پر خطرناک اثر ڈال رہی ہیں اور اس سے بچوں کے ذہن پر کبھی نہ ٹھیک ہونے والے غلط اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام تجزیاتی پروگرام کے مطالعے میں پایا گیا کہ ٹیلی ویژن کے غلط اثرات سے بچوں کے ذہن میں خطرناک قسم کی کیمیاؤں کی افزائش ہوتی ہے۔ اس سے بائیں جانب کا دماغ بالکل بے کار ہو جاتا ہے جبکہ دائیں جانب کا دماغ زیادہ سرگرم ہو جاتا ہے۔ اس سے بچوں میں غیر متوازن شخصیت کا فروغ ہوتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے سائنس دانوں نے اپنے مطالعے میں پایا ہے کہ ٹیلی ویژن سے بچوں میں انہماک کی صلاحیت اور قوتِ برداشت گھٹ جاتی ہے اور ان کے حسد اور ڈپریشن میں مبتلا ہونے کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے بچوں میں یادداشت، تجزیے اور جذبات پر کنٹرول رکھنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ اس مطالعے کے دوران کیے گئے مخصوص تجربات سے یہ بھی پتہ چلا کہ ٹیلی ویژن دیکھتے وقت بچوں میں نیم بے ہوشی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس دوران بچوں میں حسیت کی سطح گر کر نچلی سطح پر پہنچ جاتی ہے۔ دماغ کے دائیں حصے کے زیادہ سرگرم ہو جانے اور بائیں حصے کے بے کار ہو جانے کے سبب جسم میں ''انڈورفس'' نامی کیمیا کی افزائش ہوتی ہے جو جسم کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ انڈورفس کی خاصیت افیم، ہیروئن، مارفن جیسے نشیلے مادوں سے ملتی جلتی ہے اور اس طرح زیادہ دیر تک ٹیلی ویژن دیکھنے سے اسی طرح کے غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں جس طرح کے غلط اثرات ان نشیلی اشیا کے استعمال سے پڑتے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کے سائنس دانوں نے اپنے مطالعے کی بنیاد پر کہا ہے کہ ٹیلی ویژن دیکھنے سے ہونے والے نقصانات کا ازالہ علاج سے نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے ان غلط اثرات سے بچنے کا واحد طریقہ بچوں کو ٹیلی ویژن سے دور رکھنا ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھنے کے دوران بچوں کی آنکھوں پر پڑنے والے غلط اثرات کے بارے میں کیے گئے ایک مطالعے کے مطابق دیر تک اور بہت نزدیک سے ٹیلی ویژن دیکھنے کے سبب بچوں کی آنکھوں سے 'اسٹرین' (کھنچاؤ) پانی آنے اور مایوپیا جیسے مسائل اور آنکھوں کی روشنی کم ہونے کے خطرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ قومی اندھاپن مخالف سوسائٹی کی جانب سے کیے گئے ایک سروے میں تقریباً 25 فی صد بچوں کو آنکھوں کے مختلف مسائل اور روشنی میں کمی کے مسئلے سے متاثر پایا گیا۔

ادارہ 'بہتر ایتن' کے ڈائرکٹر ڈاکٹر وشال گرودر بتاتے ہیں کہ لگاتار ٹیلی ویژن دیکھنے اور کمپیوٹر پر کام کرنے سے آنکھوں میں اسٹرین اور تھکاوٹ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کے مطابق ٹیلی ویژن، ویڈیو اور کمپیوٹر جیسی نزدیک میں رکھی چیزوں کو دیکھنے کے لیے 'سلیری' خلیات کو سکڑنا پڑتا ہے تاکہ آنکھوں کے لینس کا پاور بڑھ جائے اور نزدیک کی چیزیں دکھائی پڑیں۔ ان خلیات میں بار بار بہت زیادہ کھنچاؤ ہونے پر آنکھوں میں ''مایوپیا' کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ مول چند اسپتال کے ماہر چشم ڈاکٹر اکھلیش چودھری کے مطابق کتاب پڑھنے کے مقابلے ٹیلی ویژن دیکھنے سے آنکھوں پر زیادہ غلط اثرات پڑتے ہیں۔ کتابوں میں تحریریں مستقل ہوتی ہیں جبکہ ٹیلی ویژن اسکرین پر ابھرنے والے مناظر غیر مستقل ہوتے ہیں۔ یہی نہیں ٹیلی ویژن پر مستقل نظر آنے والے مناظر میں بھی حرکت ہوتی ہے۔ یہ حرکت 'پکسلس' نامی نقطوں میں پنہاں ہوتی ہے۔ ٹیلی ویژن کے پچھلے حصے میں لگے 'الیکٹران گن' سے ٹیلی ویژن اسکرین کی پچھلی سطح پر بہت تیز رفتار سے الیکٹرانوں کی بوچھار ہوتی ہے جس نقطے پر الیکٹران پڑتے ہیں، وہ نقطہ بہت کم لمحے کے لیے چمک اٹھتا ہے۔ اس جھلملاہٹ کے سبب ہماری آنکھوں پر کھنچاؤ ہو سکتا ہے اور آنکھیں خراب ہو سکتی ہیں۔

(بشکریہ "راشٹریہ سہارا"، نئی دہلی، 26 رفروری 2004)

□□□

قومی اردو کونسل کے ایگزیکیٹیو بورڈ کی میٹنگ 30 جنوری 2004 کو انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ (ڈائرکٹر قومی اردو کونسل)،
محترمہ پیالا بنرجی (جوائنٹ سکریٹری لینگویجز، وزارت فروغ انسانی وسائل)، جناب رمیندر جاکھو ساحل (سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی)، پروفیسر گوپی چند نارنگ (وائس چیئرمین قومی اردو کونسل)،
پروفیسر حلیم خاں (چیئرمین مدھیہ پردیش مدرسہ بورڈ)، بلاس سنگھ (ڈائرکٹر فنانس وزارت فروغ انسانی وسائل) اور ڈاکٹر آر۔ کے۔ بھٹ (پرنسپل پبلی کیشنز آفیسر قومی اردو کونسل)۔

قومی اردو کونسل کی گرانٹ ان ایڈ کمیٹی کی میٹنگ 3 مارچ 2004 کو انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں
(دائیں سے) جناب ایم. ایس. خاں، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، پروفیسر گوپی چند نارنگ، مسٹر مدھوکر سنہا اور ڈاکٹر شیما رضوی۔

RNI No. 70323/99

URDU DUNIYA Monthly, April 2004, Vol. 6, Issue: 4
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

قومی اردو کونسل کی اہم ادبی مطبوعات

مرزا محمد رفیع سودا

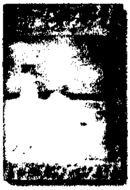

مصنف: خلیق انجم

صفحات: 673، قیمت: -/173 روپے

کلیات ذوق (اردو)

مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی

صفحات: 496، قیمت: -/93 روپے

دیوان درد

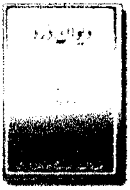

مرتب: ڈاکٹر نسیم احمد

صفحات: 336، قیمت: 160 روپے

کلیات اکبر الہ آبادی (جلد اول)

مرتب: احمد محفوظ

صفحات: 693، قیمت: -/370 روپے

دیوان اشرف علی خاں فغاں

مرتب: سرور الہدیٰ

صفحات: 285، قیمت: -/123 روپے

سورداس کے روحانی نغمے

ترجمہ و ترتیب: جعفر رضا زیدی

صفحات: 263، قیمت: -/91 روپے

اردو مرثیے کا ارتقا (ابتدا سے انیس تک)

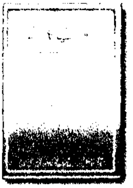

مصنف: ڈاکٹر مسیح الزماں

صفحات: 468، قیمت: -/136 روپے

مثنوی بہرام و گل اندام

شاعر: طبعی گولکنڈوی

صفحات: 236، قیمت: -/66 روپے

نوٹ:- طالب علموں اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-110006 and Published at NCPUL, West Block-I, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066, Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel : 26103381, 26103938